افکار



The

MONTHLY

AFKAR

BHOPAL

PRICE 8 ANNAS

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا
(اقبالؒ)

ماہنامہ افکار بھوپال

اگست ۱۹۴۶ء

نگراں: حکیم سید قمر الحسن

ادارہ: رشدی بھوپالی صہبا لکھنوی

"بمبئی آفس"

۲۶۴ - بلاسس روڈ، بمبئی نمبر ۸

زر سالانہ صہ
ششماہی سے ر

فی پرچہ ۸ر
بیرون ہند سالانہ ع

جلد نمبر (۳) — شمارہ نمبر (٦)

سرخیاں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۵

اشاریہ

"افکار" جس تیزی اور حیرت انگیز کامیابی کے ساتھ ترقی کر رہا ہے اس سے ادبی دنیا میں ایک ہلچل سی پیدا ہو گئی ہے بہت ہی قلیل مدت میں "افکار" نے ایک بلند مقام حاصل کر لیا ہے، پھر بھی ہم اس رفتار ترقی سے مطمئن نہیں، ہمارے راستہ میں قدم قدم پر رکاوٹیں پیش آرہی ہیں مگر ہمارے عزائم اور زیادہ غیر متزلزل شکل اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ دراصل ہم افکار کو اُردو ادب و صحافت کا ایسا نمونہ بنا دینا چاہتے ہیں جو اپنی نظیر آپ ہو۔ "افکار" کی ہر اشاعت اپنی پہلی اشاعت پر سبقت لیجانے کی کوشش کر رہی ہے جسے ارباب صحافت "ادبی معجزہ" سے تعبیر کر رہے ہیں۔ بہر حال ہم ڈینگ اور خوش فہمی کے بجائے عمل کے قائل ہیں۔ تازہ اشاعت آپکے سامنے ہے، مندرجات پر ایک نظر ڈالتے ہی آپ کو اندازہ ہو جائیگا کہ یہ کس قدر گوناگوں خوبیوں کی حامل ہے، اب کے چار افسانے ہیں۔

——— معظم علی پہلی مرتبہ بزم افکار میں شامل ہو رہے ہیں۔ نامراد، معظم علی کی افسانوی فنکاری کا لاجواب نمونہ ہے۔ گاؤں کے سادہ ماحول میں جنسی کشمکش کا جو منظر پیش کیا گیا ہے، اس میں ہزار ہا کچلی ہوئی آرزوؤں کا عکس نظر آرہا ہے

——— "آخر کار ناکامیوں اور مایوسیوں کی تاریک بدلیوں میں گھرا ہوا کلو اسو چنے پر مجبور ہو گیا کہ رحمتی اتنی بُری تو نہیں"

چمپا کلی! ——— المیۂ بنگال کا ایک دلدوز سانحہ ہے، بھوک اور پیاس سے تڑپ تڑپ کر مرجانے والے غلاموں کی عبرتناک زندگی کی جھلک ——— شہر خموشاں ——— انسانوں کا بنایا ہوا! "اس نے گلی کی طرف دیکھا ——— لاشوں کے ڈھیر پر کُتے مرے ہوئے پڑے تھے ——— اور اُس کا سر چکرا گیا!"

ناہید عالم نے "کھڑکی" میں سے ہمارے معاشرہ کا جو چہرہ دکھایا ہے اُوہ! کس قدر بھیانک ہے، ——— "وہ اس حد تک پیاسی تھی کہ اب اس کی آبحیات کو اپنے لبوں سے مس کرنے کی خواہش بھی مر گئی تھی، بس پانی ——— کھاری ——— گدلا اُبلتا ہوا، کیسا ہی ہو، مگر پانی ——— اور ان سرابوں کے چکر میں پھنس کر وہ اور بھی زیادہ پیاسی ہو گئی تھی ———"

ناہید کا افسانوی مستقبل درخشاں نظر آرہا ہے ــ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ!

"لپکا" ——— عورت کی نفسیات کا حیرتناک تجزیہ ہے، تحت الشعوری کیفیات کو قمر نے بڑی خوبی سے پیش کیا ہے ——— پھر اسے اپنی پیشانی پر مدھم سی خنکی کا احساس ہوا اور ایک بے نام سا لمس جو بڑھتا گیا بڑھتا گیا اور ہلکے سے دباؤ میں تبدیل ہو گیا، اُس نے آہستہ سے آنکھوں سے بازو ہٹایا اور چونک کر ایک دم اُٹھ بیٹھا ——— تم ——— تم نسرین؟"

سرمایہ دارانہ نظام   اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ انجم صہبائی نے مختصر طور پر سرمایہ داری کی چیرہ دستیوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں مزدور کا خون تک چوس لیا گیا ہے یہ عالمگیر بیداری کا دور ہے اور اب مزدور "تعمیری انقلاب" سے "نظام نو" کی بنیادیں قائم کر رہا ہے!

آبگینے ——— نشستند، گفتند، برخاستند! یہ ہیں "کانفرنس" کے تین بنیادی اصول جن پر ہمارے ماحول کی

کانفرنسوں کا انعقاد ہوتا ہے — ذرا سوچئے تو سہی — غلام ربانی تاباں نے جو کانفرنس منعقد کی ہے — کیا وہ حقیقت آب نہیں ؟! "کانفرنس" کا لطیف طنز تازیانۂ عبرت ہے "غلام آباد" میں بسنے والوں کے لئے!

"شبستاں" — صہباء کی ایک فنکارانہ نفسیاتی تخلیق ہے۔ شبستاں کے پس منظر میں جوانی کی سنہری راتیں ہی نہیں بلکہ بے نام آہیں اور کراہیں بھی ہیں اور پھر ایک شدید اور تلخ تاثر ہے جو ہمیں جھنجھوڑ رہا ہے، ہماری روح تک چیخ رہی ہے کہ زندگی ایک شبستان محبت ہی تو ہے!

مقبول حسین احمد پوری — گیتوں کے رسیا اس بار پھر میٹھے میٹھے بول سنا رہے ہیں — کتنے سندر اور رس بھرے ہیں یہ بول — اُن نینوں سے جب نین ملے، مرمٹنے کا ارمان کیا۔

ڈاکٹر شہرت — اس مرتبہ پھر نئے انداز سے جلوہ گر ہیں۔ "اے انسان" پڑھنے سے زیادہ سوچنے اور سمجھنے کی چیز ہے۔ نظم باوجود مختصر ہونے کے ایک مکمل درس بصیرت ہے — عظمت انسانی کا یہ مآل — اور انسانوں کے ہاتھوں — افسوس!

"عزم سفر" — یہ ہیں مجیب خیرآبادی — نوجوان ترقی پسند شاعر — !مجیب — زندگی کی کشمکش اور ماحول کی تلخیوں سے بیزار نہیں — اس کے عزائم فلک رس ہیں — وہ نہایت استقلال کے ساتھ اپنے سفر کی صعوبتوں کو برداشت کرتا ہوا جادہ پیما ہے۔

انتظار بجائے خود آتش بجاں ہے — اور پھر وہ انتظار جس سے کسی شاعر کو دوچار ہونا پڑے — اور جس کی تلخ کامیوں سے جسم وجاں سلگنے لگیں — دوسروں کے لئے تسکین کا باعث ہو یا نہ ہو — لیکن وجد کے وجدان وتصور میں تو صرف "انتظار" ہی وہ کیفیت ہے جس سے روحانی سکون مل سکتا ہے۔

آئینہ خانے، سخن پارے، سرخ ستارے، دستیں، آسرا، اور تنگ وتاز جدید تغزل کے بہترین نمونے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ ندیم، شکیل، فشور، افسوں، اقبال اور حکم سنگھ سوفی ذادب کی اس مردہ صنف میں زندگی کی ایسی روح پھونک دی ہے — جس سے غزل کا مستقبل تابناک اور درخشاں نظر آرہا ہے۔

حیف در چشم زدن

هم نہایت افسوس کے ساتھ یہ اعلان کر رہے ہیں کہ مولانا کوثر چاندپوری کو بعض سرکاری اور ذاتی مصروفیات نے "افکار" سے علحدہ کر دیا ہے۔ آپ نے اس عرصہ میں "افکار" کی جس سرگرمی اور جانفشانی سے خدمات انجام دی ہیں، اس کے لئے ادارہ ان کا خلوص دل سے شکر گذار ہے۔ بہر حال ہمیں یقین ہے کہ موصوف کی کرم اخلاقی ہمدردیاں شدید مصروفیات کے عالم میں بھی "افکار" کو حاصل رہیں گی۔

آئندہ "افکار" سے متعلقہ جملہ مراسلت بنام ایڈیٹر یا منیجر کی جائے۔

(ادارہ)

مدّوجزر

صلح کانفرنس!

ان دنوں پیرس میں صلح کانفرنس ہو رہی ہے، پہلے کانفرنسیں مسائل جنگ کو طے کرنے کے لئے ہوا کرتی تھیں، لیکن اب ان سے زیادہ اہم معاملات اور پیچیدہ امور صلح اور امن کو برقرار رکھنے کے لئے زیربحث لائے جارہے ہیں اور مختلف ممالک سے صلح کے معاہدات کی توثیق کی جارہی ہے۔ حال ہی میں وزراءِ خارجہ کی، پیرس میں جو کانفرنس ہوئی اس میں جو کچھ پیش آیا وہ ساری دنیا پر عیاں ہو چکا ہے۔ برطانیہ اور امریکہ سے روس کے اختلافات، اپنے اصلی رنگ میں منظرِ عام پر آگئے ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ میں یہ خیال پایا جارہا ہے کہ روس جرمن کمیونزم کے ذریعہ یورپ میں سیاسی تسلط قائم کرنا چاہتا ہے۔ اتحادی ممالک میں زمانہ جنگ کے دوران میں جو بدگمانیاں، غلط فہمیاں اور اختلافات ہنگامی مصلحتوں کی وجہ سے دبے ہوئے تھے اب ایک دم اُبھر آئے ہیں اور انھیں کسی طرح بھی نہیں چھپایا جاسکتا، اور یہ تسلیم کرلینا پڑیگا کہ اتحادیوں میں تصورات، معیار اور طریق کار کے بارے میں اختلافِ رائے موجود ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک حد تک یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ "اربعہ اکابر" میں نقطۂ نظر کا بھی اختلاف موجود ہے اگرچہ ابھی تک اس کا پوری طرح مظاہرہ نہیں کیا گیا ہے۔ حالات سے ایسا اندازہ ہورہا ہے کہ جرمن عسکریت کو مشرق اور مغرب کے جھگڑے میں شطرنج کے مہرے کے طور پر استعمال کیا جانیوالا ہے، اگر جرمن عسکریت کو پھوٹ ڈالکر تسخیرِ عالم کا پھر موقع دیا گیا تو اُن جانی اور مالی قربانیوں پر پانی پھر جائیگا جو دوسری جنگ عالمگیر میں دی گئی ہیں۔ اس طرح ایک دوسرے پر سیاسی غلبہ پانے کی پالیسی دنیا کے امن کو پھر خاکستر کردیگی اور انسانیت، تہذیب اور ثقافت کی تباہی و بربادی کی ایسی ہوشربا داستان کا باب کھول دیگی جسے آج تک دنیا نے نہیں دیکھا ——— چنانچہ بڑی طاقتوں کو حرص و آز کی پالیسی ترک کرکے باہمی مفاہمت اور اشتراک کے اصول پر گامزن ہونا چاہئے۔

جرمنی اور آسٹریا کے مسائل ابھی تک واقعی طور پر حل نہیں ہوئے ہیں اور اگر انھیں اطمینان بخش طریقہ سے طے نہیں کیا گیا تو یورپ میں طاقت کی سیاست جو رنگ اختیار کریگی اس کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے ——— بہرحال پیرس کی صلح کانفرنس میں دنیا کو معلوم ہوجائیگا کہ بڑی طاقتیں کس حد تک اشتراک عمل کرسکتی ہیں۔ کیونکہ پہلی مرتبہ "اربعہ اکابر" کے علاوہ دیگر اقوام کو بھی امن کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرنیکا موقع ملیگا۔ اگر برطانیہ، امریکہ اور فرانس کے ساتھ روس نے بھی صلح کانفرنس کی سفارشات پر معقولیت کے ساتھ غور کیا اور انھیں عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی تو اس میں شک نہیں کہ ایسا دیرپا امن حاصل ہوسکیگا جس کی ساری دنیا کو شدید ضرورت ہے۔

(ادارہ)

آبگینے

کانفرنس
شبستاں
آئینہ خانے
گیت
سخن پارے
اے انسان
ماورا
عزمِ سفر
سرخ ستارے
وسعتیں
انتظار
آسرا
تگ و تاز

حقیقی شعر کائنات کی حسین ترین تفسیر ہے!

کانفرنس

(ایک طنز)

نشستند:-

دیدنی تھی سوٹ اور ساڑی کی آب و تاب کل
صف بہ صف بیٹھے ہوئے تھے قائدین بے بدل
خانصاحب گل محمد، رائے صاحب رام بھل

گفتند:-

خوب تقریریں ہوئیں گپتیں ہوئیں باتیں ہوئیں
پیش تجویزیں ہوئیں جیتیں ہوئیں ماتیں ہوئیں
اور کچھ بچھڑے ہوؤں کی پھر ملاقاتیں ہوئیں

برخاستند:-

ساڑیوں کی سرسراہٹ۔ ناچ گھر کی دعوتیں
پُرتکلف بگھیاں اور بیش قیمت موٹریں
ادھ جلے سگرٹ کے ٹکڑے رم کی خالی بوتلیں

غلام ربانی تاباں

شبستاں۔!

یہ شبستانِ مسرت، یہ حریری پردے!
یہ جواں کارامنگیں، یہ ترنگیں، یہ جنوں!
یہ لہکتے ہوئے آنچل، یہ مہکتے ہوئے جسم!
یہ دمکتے ہوئے جلوے، یہ نگاریں احساس!

جنبشِ لب میں تبسم کی اداؤں کا جمال!!
مرمریں باہوں میں رقصندہ بہاروں کا شباب!!
سینۂ زیروزبر، صاعقہ اندازنظر!!
ہر قدم جیسے لچکتی ہوئی شاخوں میں گلاب!!

صرف شب بھر کے لئے زینتِ کاشانہ ہیں یہ!
یہ تخئیل کے جزیرے، یہ تصور کے محل!
صبحدم جیسے تھکی راہوں پہ رہرو کے قدم!
اور پھر سوچ وہی سوچ کے گہرے بادل!

زندگی، ایک شبستانِ محبت ہی تو ہے!!
جس کی تخلیق پہ نازاں ہے دماغِ انساں!!
سالہا سال سے گردش میں ہیں خورشید و قمر!!
پھر بھی پائندہ ہیں اسلاف کی جنت کے نشاں!!

اور "اسلاف کی جنت" کے سوا، کچھ بھی نہیں!!!
آج احساسِ ندامت کے سوا، کچھ بھی نہیں!!!

صہباء لکھنوی

آئینہ خانے!

چمن کے بھیس میں بکھرے ہوئے ہیں ویرانے
مرے خدا کی حقیقت مرا خدا جانے
میں خود شناس سہی، خوش مذاق ہے صیاد
یہ تیرہ دام، یہ تاروں کے نقرئی دانے
فسانۂ حرم و دیر ہے فریبِ خیال
قدم قدم پہ جب آباد ہیں پری خانے
بچھا دے اِن کو مری بیقرار باہوں پر
کہ بارِ زلف سے تھک جائیں گے ترے شانے
عجیب شمع ہے جو جل کے خود نہیں بجھتی
عجیب تر ہیں مگر بے نیاز پروانے
دلوں میں بس کے فریبِ تلاش دیتا ہے
اگرچہ تو نہ ملا، تیرے راز پہچانے
رُخِ ملیح، لبِ سُرخ، زلفِ ژولیدہ
بہت لطیف ہیں رسوائیوں کے افسانے
اگر یہ پہلی نظر ہے تو آگے کیا ہو گا!
چھلک رہے ہیں ابھی سے تمام پیمانے
ندیمؔ سنگ کو صیقل کیا حوادث نے
بہت قریب سے دیکھے ہیں آئینہ خانے

احمد ندیم قاسمی

گیت

اُن نینوں سے جب نین ملے، مرٹنے کا ارمان کیا
مَن موہ کی ممتا[1] سے چھوٹا، گُن گیان گیا سب دان کیا
آنکھوں میں سمایا وہ مکھڑا، ہردے[2] سے گیا جگ کا دُکھڑا
اِس جانی بوجھی دنیا کو، چاہت پہ تجا انجان کیا
چت[3] چیت[3] نہیں، سُدھ بُدھ بسری، چنتا[4] کی کلپن من سے ہٹی
اب کچھ بھی ہو دُکھ سے لگی ہے لگن، سُکھ چین سبھی قربان کیا
آشاؤں کی اُوٹ سے جھانکتی ہے جب پریم کی بھاؤنا[5] من مانی
ہردے یہ سمجھتا ہے ودھی[6] نے، کلپن کا مری کچھ مان[7] کیا
جس رات یہ پریت کی کامنا[8] ڈھل جاتی ہے منوہر سپنے میں
پل بھر کو یہ دھوکا ہوتا ہے، جیون نے بنا سامان کیا
من بھاؤنی چاہت کو لیکر، ہر چیز سے جی ہٹ جاتا ہے
کہتی ہے کلیجے سے یہ کسک، لے کام ترا آسان کیا
سُن لیجئے احمدپوری نے، سنگیت بھرا ہے شبدوں[9] میں
جس کان پڑے یہ گان[10] مرا، یہ جان لے مدھ[11] کا پان[12] کیا

[1] تمنا - آرزو - خواہش
[2] دل
[3] ہوش - سمجھ - بوجھ
[4] فکر
[5] جذبہ - خواہش
[6] خدا (اس کا لفظ ودھاتا ہے)
[7] منظور - قبول
[8] حسرت - تمنا
[9] اشعار یا لفظوں میں
[10] گیت
[11] شہد - شراب
[12] نوش کیا - پیا

مقبول حسین احمدپوری

سخن پارے!

بے خودی ہے نہ ہوشیاری ہے
بادہ خواری سی بادہ خواری ہے

حُسن مصروفِ پردہ داری ہے
جانے اب کس نظر کی باری ہے

تو نے دیکھی تو ہوگی اے ناصح
وہ محبت جو اختیاری ہے

کم نہیں شورشِ نفس لیکن
زندگی پر جمود طاری ہے

غمِ الفت تو دل سے ہار چکا
اب غمِ زندگی کی باری ہے

جس چمن میں کبھی نہ آئے بہار
اُس چمن کی خزاں ہی پیاری ہے

ہائے وہ بادہ کش کہ جس نے شکیلؔ
زندگی بے پئے گذاری ہے

شکیلؔ بدایونی

اے انسان!

تمام شعلہ و شرر ہے کُل تجلیات میں
جہاں پہ عزمِ غزنوی وہیں پہ سومنات ہے
زمیں تری فلک ترا یہ تیری کائنات ہے
حیات پا بہ گِل سہی حیات پھر حیات ہے
ہیں مہر و ماہ کے لئے یہ دن بھی اور رات بھی
ترے سفر کے سامنے نہ دن ہے اور نہ رات ہے
ترے ہر ایک نقشِ پا میں گم ہے عمرِ جاوداں
یہ تجھ سے کس نے کہدیا جہانِ بے ثبات ہے؟
شکستہ پائے زندگی ہیں جس کے اس کا کچھ نہیں
جو تیز رَو ہے راہ میں اسی کی کائنات ہے
ترے قدم پہ سجدہ ریز ہیں جُنوں کی عظمتیں
تری ہی وسعتوں سے یہ وجودِ شش جہات ہے
ہر ایک ذرّۂ رہِ عمل ہے ایک کربلا!
ہر اِک امامِ تشنہ کام کے لئے فرات ہے!

ڈاکٹر شہرت

ماورا

ورائے جفا و وفا ہو گئے ہم — بڑی کشمکش سے رہا ہو گئے ہم
کہیں کیا کہ مل جل کے کیا ہو گئے ہم — وہ بجلی بنے تو گھٹا ہو گئے ہم
خدا آشنائی تو ہے اک بڑی شَے — یہ کیا کم ہے خود آشنا ہو گئے ہم
یہ غم ہے کہ چھوٹے اسیری کے ساتھی — مسرت نہیں گر رہا ہو گئے ہم
کچھ اس طرح گذریں مسرت کی گھڑیاں — کبھی وہ، کبھی خود خفا ہو گئے ہم
خدا کے بھروسے، خدا کے سہارے — سفینے کے خود نا خدا ہو گئے ہم
عمل زارِ ہستی میں افسوس یہ ہے — اسیرِ سزا و جزا ہو گئے ہم
ہوئیں ملتفت کب وہ کافر نگاہیں؟ — جب آلودۂ ما سوا ہو گئے ہم
رہے گو جہاں میں بہت بچ بچا کر؟ — مگر پھر بھی نذرِ خطا ہو گئے ہم
محبت میں ایسا بھی اک دور آیا — کہ مجبورِ ترکِ وفا ہو گئے ہم
لبوں پر شکوں اور آنکھوں میں آنسو! — بھری انجمن میں یہ کیا ہو گئے ہم!!؟
چمن بھی ہے اک مستقل قید خانہ — اگرچہ قفس سے رہا ہو گئے ہم
بہ باطن حواسوں پہ ہے کوئی قابض — بظاہر کسی سے جدا ہو گئے ہم
خودی نے کچھ اس طرح طوفاں اٹھائے — کہ بندے یہ سمجھے خدا ہو گئے ہم
ابھی اُن کے غم کا سہارا ہے باقی — نہ سمجھو کہ بے آسرا ہو گئے ہم

مصائب کچھ اعجاز ایسے اٹھائے
غم و رنج سے ماورا ہو گئے ہم

اعجاز صدیقی

عزمِ سفر!

جھوم کر عزمِ جواں تاب کی بیداری سے ـــ کام لیں! رندی و بدمستی و سرشاری سے
چین پا جائیں نگاہوں کی شرر باری سے ـــ کھیلتے جائیں زمانے کی ستم گاری سے
دور ہر کشمکشِ گردشِ ایام سے دور!
اُٹھ کہ جانا ہے بہت دور۔ بہت دور ابھی!!

شورشِ غم کی فلک گیر گھٹاؤں سے بھی دور ـــ غنچہ و گُل کی شرربار فضاؤں سے بھی دور
مہ جبینانِ سمن بر کی اداؤں سے بھی دور ـــ اس چمن زارِ غلامی کی ہواؤں سے بھی دور
معبدِ کفر و تجلّی گہہِ اصنام سے دور!
اُٹھ کہ جانا ہے بہت دور۔ بہت دور ابھی!!

تیز ہاں اور قدم تیز! اُٹھاتا ہوا چل ـــ مسکراتا ہوا طوفانوں پہ چھاتا ہوا چل
راہ پُرخار ہے دامن کو بچاتا ہوا چل ـــ جذبۂ شوق کو مہمیز لگاتا ہوا چل
ذوقِ آسائش و ہر خواہشِ آرام سے دور!
اُٹھ کہ جانا ہے بہت دور۔ بہت دور ابھی!!

ذوقِ خوابیدہ کو ہر گام صدا دیتا جا ـــ محفلِ عیش کو پیغامِ قضا دیتا جا
زلفِ برہم کو سنورنے کی ادا دیتا جا ـــ شعلۂ عزمِ بغاوت کو ہوا دیتا جا
فکرِ آغاز سے اندیشۂ انجام سے دور!
اُٹھ کہ جانا ہے بہت دور۔ بہت دور ابھی!!

کتنے سوئے ہوئے فتنوں کو جگانا ہی ابھی ـــ حشر اُٹھانا ہے ابھی آگ لگانا ہے ابھی
قصر و ایوانِ امارت کو بھی ڈھانا ہی ابھی ـــ خرمنِ ظلم پہ اک برق گرانا ہے ابھی
ساقی و ساغر و مینائے گلفام سے دور!
اُٹھ کہ جانا ہے بہت دور۔ بہت دور ابھی!!

ہم سفر! ہاں ابھی درپیش سفر اور بھی ہے! ـــ ذوقِ منزل کی قسم! حدِ نظر اور بھی ہے!!
ظلمتِ شب ہی نہیں ـ راہ گزر اور بھی ہے! ـــ اس سیاہی کے دھندلکے میں سحر اور بھی ہے!!
خوفِ آغازِ سحر ـ وسوسۂ شام سے دور!
اُٹھ کہ جانا ہے بہت دور۔ بہت دور ابھی!!

مجیب خیرآبادی

سُرخ ستارے

چلمن سے جو دامن کے کنارے نکل آئے
وارفتہ نگاہی کے سہارے نکل آئے

پیمانہ بکف ساتھ تمھارے نکل آئے
ہنگامۂ ہستی سے کنارے نکل آئے

اک سادگیٔ حسن کی معصوم ادا میں
رنگین مضامین کے اشارے نکل آئے

دولت کا فلک توڑ کر عالم کی جبیں پر
مزدور کی قسمت کے ستارے نکل آئے

سب ڈوب گئے تلخیٔ ناکامیٔ غم میں
کچھ آپ کے دامن کے سہارے نکل آئے

گستاخیٔ باراں سے وہ پیراہن پُر نم
بھیگے ہوئے جلوؤں سے شرارے نکل آئے

تقلیب کا زمرہ بھی نہیں درد سے خالی
ان میں سے بھی کچھ عشق کے مارے نکل آئے

آنکھوں میں نظر آنے لگے خون کے آنسو
بس اُٹھو کہ وہ سُرخ ستارے نکل آئے

رضواں سے بغاوت ہے نشور اور مئے کوثر
عقبیٰ میں بھی کچھ کام ہمارے نکل آئے

نشور واحدی

وسعتیں

جب سے وہ چشم التفات نہیں — روح میں گرمئ حیات نہیں
ہم وہی ہیں مگر وہ بات نہیں — حسنِ صورت ہی حسنِ ذات نہیں
جانتے وہ بھی ہیں کہ ان کے بغیر — زندگی موت ہے حیات نہیں
جو اشاروں پہ تیرے جیتے ہوں — ان کو مرنا بھی کوئی بات نہیں
مجھ کو نسبت ہے تیرے جلووں سے — رات بھی میری دن ہے رات نہیں
کیا غضب ہو گئی نگاہِ کرم — جیسے مجھ میں مری صفات نہیں
حسن کو خود ہی بار تھا جس پر — اک وہی لمحۂ حیات نہیں
دل پہ بن بن گئی ہے فرقت میں — وہ سمجھتے ہیں کوئی بات نہیں
ہاں نہ ہوں میری مشکلیں آساں — میں نہیں ہوں کہ کائنات نہیں
تو کہ ہم اہل عشق کی فردوس — ہائے دنیا تجھے ثبات نہیں
ہم سے وہ بدگماں ہیں ہم اُن سے — اب زباں پر دلوں کی بات نہیں
ان کے جلووں میں گم ہیں یوں نظریں — واقعی جیسے کائنات نہیں
شوق کی وسعتیں ارے توبہ — کوئی قیدِ تعینات نہیں
عشق خود ہے ہمہ حیات وبقا — عشق وابستۂ حیات نہیں

موت کیا مانگئے کہ اے افسوںؔ
زندگی سے کہیں نجات نہیں

افسوںؔ بھوپالی

انتظار!

کھل گئی آج برستی ہوئی ساون کی گھٹا
دھل کے شفاف نکل آیا ہے شب کا چہرہ
ڈھل گئی نور کے سانچے میں اندھیری دنیا، کوئی ابتک نہیں آیا مرے ویرانے میں

یہ شب ماہ کے بکھرے ہوئے بھیگے گیسو،
جیسے انگڑائیاں لیتا ہوا جاگے جادو
میرے ہر زخم سے آتی ہے کسی کی خوشبو، کوئی ابتک نہیں آیا مرے ویرانے میں

چاند جیسے کسی تالاب میں شاداب کنول
وہ ہوائیں کہ ہو جنبش میں کسی کا آنچل
دور بجتی ہے سر راہ کسی کی چھاگل، کوئی ابتک نہیں آیا مرے ویرانے میں

آخر شب یہ اجڑتا ہوا تاروں کا سنگھار
جیسے روندی ہوئی کچلی ہوئی گلشن کی بہار
جیسے بجھتے ہوئے امید کی آنکھوں کے شرار، کوئی ابتک نہیں آیا مرے ویرانے میں

بجھ گئے رات کے جلتے ہوئے پُر نور چراغ
ہو گئے سرد مہکتے ہوئے پھولوں کے ایاغ
گم ہوئی جاتی ہیں ظلمات میں راہوں کے سراغ، کوئی ابتک نہیں آیا مرے ویرانے میں

سو گئے زانوئے خورشید پہ تابندہ نجوم
دل میں باقی نہ رہا، شوق و تمنا کا ہجوم
صبح ماتم ہے وہاں شام جہاں تھی اک دھوم، اور کوئی پھر بھی نہ آیا مرے ویرانے میں

وجد چغتائی

آسرا

موت کو بھی زیست کی منزل بنا دینا پڑا
ہر قدم پر اُن کے غم کو آسرا دینا پڑا

اک زمانے کو رہا دیر و حرم میں اختلاف
تیرے سنگِ در پہ سب کو سر جھکا دینا پڑا

آندھیاں ایسی بھی کچھ آئیں جہانِ عشق میں
خود چراغِ آرزو مجھ کو بجھا دینا پڑا

زندگی کے نام پر کیسی خوشی کس کی خوشی
تیرے غم کی آڑ لیکر مسکرا دینا پڑا

آگئی پروانہ بنکر جس کی ضو میں زندگی
ایک ایسا بھی چراغِ غم جلا دینا پڑا

مرحبا صد مرحبا اے میری چشمِ اشتیاق
آج ان کو بھی نقابِ رخ اُٹھا دینا پڑا

پیش آئے راہِ ہستی میں وہ نازک مرحلے
یاس کو امید بنکر آسرا دینا پڑا

عشق مجبورِ وفا تھا۔ حسن مجبورِ ستم
روئی جب شبنم گلوں کو مسکرا دینا پڑا

لاکھ چاہا چپ رہوں اقبالؔ بزمِ ناز میں
پھر بھی ان آنکھوں کو افسانہ سنا دینا پڑا

اقبال خلیلی صفی پوری

تگ و تاز

آدمی خاک بھی ہے، خاکِ سرافراز بھی ہے
یہ حقیقت بھی ہے۔ افسانہ بھی ہے۔ راز بھی ہے

حسنِ معبودِ دل و دیدہ نہیں ہے تنہا
عشق خود اپنا خدا بھی ہے، خداساز بھی ہے

غضب۔ تیرے تغلب کا خلل ہے۔ ورنہ
نگہِ رندِ خرابات حرم ساز بھی ہے

کیوں اسیروں کو نہیں راس گلستاں کی ہوا
جرأتِ نغمہ بھی ہے۔ طاقتِ پرواز بھی ہے

ایسے ماحول میں جینے کی تمنا کرنا
میرا ایثار بھی ہے، آپ کا اعجاز بھی ہے

تیری بیداد باندازۂ بیداد نہیں
تیری بیداد میں اک لطف کا انداز بھی ہے

جس نے سطرِ پہ نجوم آ کے بسایا کونین
کیا ترے ساز میں ایسی کوئی آواز بھی ہے

خود فریبی میں گرفتار ہیں یوں اہلِ ہوس
حسرتِ دل کی [illegible] دنیائے تگ و تاز بھی ہے

میں نے اس ڈھب سے گزاری ہے جوانی محکم
کچھ ندامت بھی ہے اس پہ مجھے کچھ ناز بھی ہے

محکم سنگھ سونی

آبشار

نامراد

چمپاکلی

کھڑکی

لچک

ہر حقیقت ایک خاموش افسانہ ہے اور ہر افسانہ ایک بےحجاب حقیقت۔

معظم علی ایم۔ اے

نامراد

اور وہ پانچویں بار بھی نامنظور کر دیا گیا۔

جب اُس کے مرحوم بھائی کی جواں سال بیوی رحمتی نے حسبِ معمول انگلیاں چٹخاتے اور ناک سڑکتے ہوئے اُسے یہ منحوس خبر سنائی تو جھانجنوں کی چھوٹی سی پوٹلی جسے وہ حرزِ جان بنائے ہوئے تھا اور جو اُس کی روکھی پھیکی منجمد زندگی میں ذرا دیر کے لئے ہلچل پیدا کر دیتی تھی، اُس کے ہاتھوں سے پھسل کر زمین پر جا پڑی "چھن، چھنن، چھن" اُسے محسوس ہوا کہ فاطمہ۔ ننھی۔ زینب۔ آمنہ اور بسم اللہ اپنے کھردرے سانولے پیروں کو اُس کی حاصلِ حیات جھانجنوں سے سجائے ہوئے گاؤں کے مختلف لڑکوں کی شکل کے خوفناک بھتنوں کے حلقہ میں اُس کے سینے پر مصروفِ رقص ہیں "چھن، چھنن، چھن" اُس کے کانوں میں عجیب عجیب سی آوازیں گونجنے لگیں۔ سینے پر جیسے منوں بھاری سل رکھدی گئی ہو۔ اُس کا دم گھٹنے لگا۔ چاروں طرف اندھیرا سا چھا گیا اور اس تاریکی میں اُسے محسوس ہوا کہ اُس کے ہاتھوں سے بچاؤ کا آخری سہارا بھی چھوٹ گیا اور وہ تاریک سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب رہا ہے، ڈوبا جا رہا ہے، ڈوبتے ڈوبتے اُس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ پورے گاؤں کو نہیں تو اُن لڑکوں اور لڑکیوں کو جو اُس کی دانست میں محض اُسے چڑانے کے لئے شادیوں پر شادیاں کئے جا رہے تھے ضرور اپنے ساتھ گھسیٹ لے اور سب کے سب بے پناہ گہرائیوں میں اس طرح دفن ہو جائیں، جہاں سے واپسی کا تصور محال ہو۔

اور یہ آخری چوٹ سب سے زبردست تھی۔ اُس کی منظورِ نظر بسم اللہ ——— ! وہ تصور میں اُس کے قدرے صاف رنگت کے چھوٹے چھوٹے چپٹے جھانجنوں سے مزین پاؤں کو اپنے دل میں اتار چکا تھا۔ وہی بوٹے سے قد کی بسم اللہ ننھی اُس سے چھین لی گئی اور شاید غفورا کو سونپ دینے کے لئے۔ غفورا جو کسی نامعلوم بنا پر ہمیشہ اُن کے دکھوں میں مزید اضافہ کا باعث تھا۔

"اللہ کرے ننھی سہاگ رات ہی کو رانڈ ہو جائے، ہیضہ پڑے اس موئے غفورا پہ" اُس کی بھاوج بسم اللہ کو کوس کوس کر گویا اُس کے زخموں پر مرہم رکھ رہی تھی اور کاجل سے پُر آنکھوں کو آنچل سے خواہ مخواہ ملے جا رہی تھی۔ غفورا کو ہیضہ ہو جانے پر اُسے اعتراض نہ تھا۔ مگر شادی کے دن سُرخ ٹول کی چم چم چمکتی ہوئی اوڑھنی کی جگہ بسم اللہ کا سفید بغیر گوٹ کا دوپٹہ اُس کے تصور میں لہرا گیا۔ اور اُس کی لال ہری چوڑیوں کی کرچیں گویا اُس کے کلیجہ میں چبھ گئیں۔ اپنی ناکامی کا صدمہ ہی کونسا کم تھا۔ کہ بسم اللہ کی آنسوؤں سے لبریز آنکھیں اُس کی نظروں میں پھر گئیں۔ یہ اُس کے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔ اُسے بسم اللہ سے باقی سب لڑکیوں سے زیادہ محبت تھی۔ وہ اس حد تک متاثر ہوا کہ باوازِ بلند رونے لگا۔

"تجھے آئے ڈھائی گھڑی کی موت۔ سانڈ!" بڑھیا ماں ہنکاری۔ "یہ بڑا لونڈا چلا بھوں بھوں رونے تجھی تو جورو نا جڑتی۔ تیری عمر میں بڑے کو تیسری لگائی ل گئی تھی اور گیرہ اوپر دو بیسی کا تھا جب تیری یہ بھاوج آئی۔ چھوٹے ہی کو دیکھلے۔ دو بچوں کا باپ ہے، دوکا۔ تیری جیسی زنانوں کی سی باتیں کرتا تو کون لونڈیا دیدیتا۔

"نکھٹو!" نکھٹو اور گھر۔ پھر جیسے یونہی بھینس کی جوں اختیار کرتا جا رہا تھا۔ بڑے تو اپنے دم توڑتے ہوئے ارمانوں کی تسکین کی خاطر رحمتی کو اُس کی چھاتی پر مونگ دلنے کو چھوڑ بیکنٹھ کو سدھار ے اور چھوٹا نہ جانے کہاں مرا کھپا۔ ماں سے جھگڑا کر کے بیوی بچوں کو لیکر جو گھر سے نکلا تو پلٹ کر خبر بھی نہ لی ــــ مگر بڑھیا کو سوچنے سمجھنے کی غرض ہی نہیں تھی، بس اُس کی تو زبان ذرا سی چھیڑ سے دن بھر کے لئے رُواں ہو جاتی تھی اور وہ نت نئے طنزیہ نشتر چبھوتی تھی کہ کلّو کا جی گھر سے بھاگ جانے کو چاہتا تھا۔ بیوی ہوتی تو کب کا اُسے لیکر ماں سے الگ ہو گیا ہوتا۔ اب کس بل بوتے پر ہمّت کرے۔ کھانے کے بھی لالے پڑ جائیں گے۔ بے غیرتی لادے پڑا ہوا تھا۔ بیوی نہ ہوتی تو ــــ مگر بیوی! تازہ چوٹ پرانے زخموں کو بھی چھیڑ گئی۔ فاطمہ۔ ننھی۔ زینب اور بسم اللہ! سب کی یاد بیک وقت اُس کے دل کو چھیدنے لگی وہ اور بھی زور زور سے رونے لگا۔

"چپ جا رے حرامی" ماں بڑی بڑی گالیاں بکھیرنے لگی۔

"ہی ہی ہی۔ زنانوں والی باتیں۔ ہی ہی ہی" رحمتی کھلکھلائی۔ جیسے کمبخت جنم سے اُس کی بیرن ہو۔

پڑوس کی آگ بہت سے دلوں کے مرجھائے ہوئے پودوں پر ابرِ رحمت بنکر برستی ہے اور پھر کلّو کے گھر کی آگ جو گاؤں بھر کے لئے مایۂ تفریح تھا۔ اُس کے گھر میلا سا لگ گیا۔

"کا ہوئے رے؟" ایک دوسرے پر مستفسرانہ انداز سے ٹوٹا پڑتا تھا۔

"سانپ ڈس گیا رے کلّو کو" ایک واقف راز منچلا نوجوان ہنسنے لگا۔

"ڈس گیا ہوتا سانپ ہی موئے کو، یہ بدنامی تو نہ ہوتی رے۔ ہائے مولیٰ۔ ہوتے ہی کیوں نہ اُٹھا لیا تونے اس جی کے جنجال کو۔ ارے خود تو چلدیئے۔ کاہے چھوڑ گئے اس بس کی گانٹھ کو۔" مرحوم شوہر کی زیادتی پر بڑھیا کی آنکھیں کم اور زبان موسلا دھار برسنے لگی۔

"کا ہوا رے کلّو، جی تو اچھا ہے؟" غفورا نے ہمدردی کی آڑ میں اُسے چھیڑا۔

"میں بتاؤں بھیا۔ ہی ہی ہی" بسم اللہ کی ماں نے کہا "بھا آئی نا ہے لونڈیا جو اس پاگل نکھٹو سے قسمت پھوڑوں، بس جدھی سے رو رہے ہیں۔ ہی ہی ہی"

رحمتی کی ہنسی کسی طرح قابو میں نہ آتی تھی۔

"واہ رے میرے شیر" ایک مشترکہ قہقہہ سیسہ کی گولی کی طرح کھٹاک سے کلّو کے دل و دماغ پر جا لگا۔

"بسم اللہ ہی ہیں کونسے موتی ٹنکے تھے۔ چل ہم دلوائیں ایک سے ایک سندر چھوکری" غفورا نے ذومعنی انداز سے رحمتی کی طرف دیکھا۔

"ہی، ہی ہی" وہ لال ہو گئی اور انداز بدل کے کلّو کی طرف بڑھی۔

"اُٹھو مورے دیور جی، یو ہنسی مجاک تو رہے ہی ہے۔ بسم اللہ ہی تمہا کا کر دیتی جو میں نا کر سکوں۔ میں آپی تمہرے کپڑوں پر پیوند لگا دونگی، تمہری روٹی سینک دونگی اور ــــ" ہزاروں کچلی ہوئی اُمنگیں اور ناتمام آرزوئیں اُس کی آنکھوں میں سے جھانک رہی تھیں۔

کلّو جو جلا بھنا بیزار سا بیٹھا تھا، رحمتی کے خلوص کو اُس کی، داکاری ہی سمجھا، وہ جا بھی اُس کا مذاق اڑانے میں پیش پیش تھی کلّو کیونکر اس کا اعتبار کر سکتا تھا۔ اُس نے جھنجھلا کر اُسے دھکّا دیدیا۔ اس کی دانست میں اُس کی ساری مشکلات و مصائب کی ذمہ دار وہی تھی۔

"باؤلا ہوگیا رے" ماں تنہا غرائی۔

"تو چپ جا ماں، نہیں تو اپنی اور تیری جان ایک کر دوں گا" اس تمام عرصہ میں اُس نے پہلی مرتبہ زبان کھولی۔

"پاگل ہے بے پاگل" مجمع میں سے کوئی چلایا۔

"پاگل ہے بے پاگل" سب نے اس دریافت کی تائید کی۔

"آؤ سالو ــ" وہ غصہ سے بیتاب ہوکر پاگلوں کی طرح ڈھیلے سمیٹتا ہوا لوگوں پر برس پڑا۔

عدّت کے بعد رحمتی سسرال آئی تو وہ پہلے سے بھی زیادہ تندرست ہو رہی تھی، چہرہ خون کی حدّت سے سانولا گیا تھا۔ بےچین سی، بوٹی بوٹی تھرکتی ہوئی۔ عجیب پاگل سی آنکھیں۔ بہکی ہوئی چال۔ رگ رگ سے جوانی پھٹی پڑتی تھی کلّو نے اُسے مشکوک انداز سے دیکھا، مگر وہ بہت کم کسی بات پر غور کرنے کا عادی تھا، وہ سادگی کی حد سے بڑھا ہوا سیدھا سادھا آدمی دنیا کی باتوں سے بےخبر اپنے کام سے کام رکھنے کو ہی زندگی سمجھتا تھا۔ زندگی کی پُرپیچ پگڈنڈیوں پر قدم دھرنے کی اس میں ہمّت تھی نہ اہلیت۔ اُس کی دنیا اُس کا تخیّل اُس کی بوڑھی ماں، بڑا بھائی، چھوٹے کی گھر چھوڑ کر چلے جانے کی حرکت سے اُسے صدمہ پہنچا تھا اور وہ اس کا ذکر بھی نہ سننا چاہتا تھا۔ چند زنگ خوردہ استروں اور مسافروں کا سامان اسٹیشن سے ان کے گھر تک پہنچا کر حاصل کئے ہوئے چند آنوں تک محدود تھا۔ مدّت سے اُس کی زندگی کسی تغیّر کے بغیر ایک ہی رفتار سے گذر رہی تھی، وہ اس یکسانیت سے خوش اور مطمئن تھا۔ اس کے بھائی کے انتقال کے بعد گویا گاڑی ایک جھٹکے سے رُکی اور پھر اُسی رفتار سے چلنے لگی۔ ہاں رحمتی کی آمد نے گھر بھر میں ہل چل مچا ڈالی اور اُس نے اپنی بیباک شوخیوں اور خطرناک حد تک بڑھی ہوئی بےتکلفی سے اُس کے دل و دماغ کو جھنجوڑ ڈالا۔ معلوم نہیں اُس نے تختہ مشق کلّو کو ہی کیوں بنایا۔ گاؤں کے بہت سے چھوکرے اُس کے اشاروں پر سرِ تسلیم خم کرنے کو تیار تھے۔ شاید اُسے گھر کی دال مرغی سے بھلی معلوم ہوتی تھی، وجہ جو کچھ بھی ہو۔ کلّو پر عنایتوں اور نوازشوں کی بارش ہونے لگی۔ مگر کلّو میں اتنی غیرت اور سمجھ ضرور تھی کہ اپنے بھائی کی ناموس کا لحاظ رکھتا۔ وہ رحمتی کو ماں کی تنہائی اور بڑھاپے میں کام کاج کی تکلیف کی وجہ سے اُس کے میکے بھجوانے میں ناکام رہا تو اس نے اُس کا وجود ہی نظرانداز کرنا چاہا، مگر وہ ربڑ کی گیند کی طرح جتنی زور سے پٹخو اُسی قدر اُچھلنے والی خاصیت کی لڑکی مست ہاتھی کی طرح جھومتی جھامتی وقتاً فوقتاً اُس کے سینے پر سوار رہنے لگی۔

"دیورجی، کاہے چپ چپ لیٹے رہو، پاؤں دُکھے، لاؤ میں دبا دوں" کمر کو لچکاتی مستی آلودہ ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیرتی ہوئی وہ دھب سے کلّو کی چارپائی پر اس طرح جا پڑتی کہ اُس کا بالائی حصہ جسم کلّو کے گھٹنوں سے ذرا اوپر جا ٹکرا تا اُس کے اعصاب میں لمحہ بھر کے لئے ہیجان سا پیدا ہوتا، دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی پتلیاں تیزی سے حرکت کرنے لگتیں مگر لمحہ بھر کے بعد بالکل سکون ہوتا، وہی پہلے کا سا جمود۔

"کاہے گری پڑے ہے ری، ہٹ کے بیٹھ" وہ اکھڑپن سے چلاتا۔

رحمتی کو غالباً اُس کی بات کو برا ماننے کی فرصت نہ ہوتی تھی وہ ڈھٹائی سے اُس کے اوپر ڈٹی جاتی، اس کا تنفس تیز ہو جاتا اور آنکھیں کسی شرابی کی آنکھوں کی مانند چڑھ جاتیں۔

"ہمکا ڈراتے دیورے، یو دیکھو۔ دل کا زور زور سے چلے ہے" وہ کلّو کا فولادی ہاتھ ایک زہرشکن ادا سے سینے پر رکھ کر زور سے بھینچ لیتی کلّو متاثر ہوئے بغیر نتائج سے آہستہ ڈھکیل دیتا۔ اس آڑے وقت میں برکت جیسے چوٹی جماعت تک کے پڑھے لکھے شہری دوست کی صحبت اور امام صاحب کی تعلیم بھرتا آڑے آئیں۔ امام تنہا

امام صاحب اُس کی خدمت کے صلہ میں اُسے خدا اور رسول کے احکامات بتایا کرتے تھے اور برکت نے شہر میں دیکھی ہوئی فلموں اور سُنی سنائی کہانیوں سے اخذ کئے ہوئے نتائج کی بناء پر اُسے خوب وزشت میں امتیاز کرنے کے قابل بنا دیا تھا۔ اُس نے اپنے اندر کے شیطان کو ہی شکست نہیں دی تھی۔ بلکہ ایک اور ہستی کو بھی ڈوبنے سے بچا لیا تھا اُس کا سر فخر سے اونچا ہو جاتا۔ سینہ تن جاتا اور اُسے اپنے چہرہ سے بارشِ انوار ہوتی ہوئی محسوس ہوتی۔

مگر رحمتی ——— اِس بارشِ انوار سے صرف اس حد تک متاثر ہوئی کہ اُس کے ہونٹوں کی نمی بڑھ گئی۔ شانوں پر پڑی ہوئی اوڑھنی لرزنے لگی اور آنکھیں اور زیادہ شرابی ہو گئیں۔ بار بار ڈھکیل دیئے جانے پر بھی اُس کے انداز سے ندامت و مایوسی کا اظہار نہ ہوتا تھا اور وہ ارادوں کی پختگی کے ساتھ محاذ پر جمی رہی۔

"نماج پڑھا کر نماج" وہ عاجز ہو کر اُسے مذہب کی یاد دلاتا "اللہ کے نام میں بڑا اثر ہے۔ شیطان بھاگ جائیگا"

مگر شیطان تو گویا پوری طرح رحمتی میں حلول کر چکا تھا۔ اُس کی جدوجہد جاری ہی رہی۔ گر کلو جیسے منحوس آدمی کے سامنے رحمتی کی لطیف کوششیں کسی طرح بار آور ہوتی نظر نہ آئیں، تب بھی وہ مایوس نہ ہوئی اور اُس کے دور رس دماغ نے ایک نسبتاً مؤثر تدبیر سوچ نکالی۔ اُسے معلوم تھا کہ ماں کی موت کی دھمکی کلوا کی دکھتی ہوئی رگ ہے جب وہ اپنا سپاٹ سینہ کوٹتے ہوئے چیخ چیخکر میاں عزرائیل کو دعوت دیتی تو کلوا لرز جاتا۔ اُس کی پیاری ماں جس نے خود مر مر کر اُسے جلایا ہے ——— وہ اپنی بیماری کے چند مہلک ایام، جب اُس کی ماں نے اس کے لئے اپنی جان جوکھوں میں ڈالدی تھی، فراموش نہ کر سکا تھا ——— وہی پیاری ماں اُس کی خاطر جان دے، یہ اُسے منظور نہ تھا۔ وہ اپنی مرضی کے خلاف بھی بڑی سے بڑی بات کر گزرنے پر تیار ہو جاتا۔ ماں اور رحمتی دونوں اس حربہ سے اچھی طرح واقف تھیں جو اُن کے لئے ایک طرح سے علاء الدین کا چراغ ثابت ہوتا تھا۔ پٹھے پر دلوں کے لئے گڑ کی مٹکی خالی ہوتی، تو ماں ایک بڑی سی گالی اُس کے باپ کو دیکر اور اُس کے سر پر انڈے کی شکل کے محنت سے بنائے ہوئے میدان پر دوہتڑ رسید کرتے ہوئے اُسے بازار جانے کو کہتی۔ ہمت سے زیادہ بوجھ لاد کر میلوں دوڑنے کی وجہ سے اُس کی گردن اکڑی ہوئی ہوتی اور پاؤں کی ہڈیاں چیخ چیخ کر بغاوت کا اعلان کرتیں، وہ انکار کرنا چاہتا، مگر ماں کا ہوا میں اُٹھا ہوا ہاتھ اور ہونٹوں کو آمادۂ گفتار دیکھ کر اُس کی ہمت پست ہو جاتی، وہ گھسٹتا ہوا اُٹھتا، وہ تیزی سے چلتا اور پھر گھسٹنے لگتا۔

رحمتی نے اپنی ساری توجہ بڑھیا کی جانب منعطف کر دی۔ اُس کے ہاتھ پاؤں زیادہ جوش سے کوٹنے لگی، پورا پورا دن بڑھیا کے بالوں کی الجھی ہوئی گنجان جھاڑیوں میں جوؤں کی کھوج میں صرف کیا، اُس کے کپڑے صابن کے بغیر پٹخ پٹخ کر اُجلے کر دیئے اور سب سے زیادہ جس بات نے ماں کو متاثر کیا وہ یہ تھی کہ وہ تیسرے دن چربی میں تر بتر بھنا ہوا گوشت اُسے کھلانے لگی اور کلوا کی تن پیٹ کاٹ کر اکٹھی کی ہوئی پونجی روز بروز کم ہونے لگی۔ ماں کو خیال آیا کہ رحمتی جوان ہے اور کلوا کی بیوی ممکن ہے کچھ ایسی تیز طبیعت کی آئے کہ اُسے اس گھر سے جہاں اُس نے نصف صدی سے بھی زیادہ راج کیا تھا۔ نکال باہر کرے۔ یہ خدشہ موہوم سا ہی تھا۔ اُس کا گرانڈیل شوہر جو بات سے پہلے اُسترا نکالنے پر آمادہ رہتا تھا، اس کے سامنے ہمیشہ بھیگی بلی بنا رہا تو دو بالشت کی چھوکری کی تو بات ہی کیا، البتہ وہ اُسے بھنا ہوا گوشت کبھی نہ کھلا سکتی تھی اور بیچاری رحمتی، اُس نے دنیا کا دیکھا ہی کیا تھا، چھ مہینے بھی تو اُس کا میاں زندہ نہ رہ سکا۔ یہ الگ بات تھی کہ شادی کے دوسرے دن میکہ جا کر وہ عدت کے ایام گذار کر ہی سسرال آئی۔ رحمتی کا درد اُس سے زیادہ اور کون سمجھ سکتا تھا۔ اُس کی آدھی زندگی بھی بیوگی کی حالت میں گذری تھی اُس کے سامنے تو تین تین لڑکے موجود تھے، پھر بھی وہ ساون کی

بھیگی بھیگی راتوں کی کسک آمیز آندھیاریاں تنہا نہ گذار سکی تھی، اُس کا دل رحمتی کے لئے درد سے بھر گیا اور اُس نے کلوا کو بجھوا رنے، سہاگ پوڑہ اور ہری مہندی لانے کا حکم دیا، سُرخ ٹول کی اوڑھنی رحمتی کے پاس موجود ہی تھی، برادری کی دعوت کے لئے چاولوں اور راڑ کی ضرورت تھی جس کے حصول میں کچھ دقت ضرور تھی، لیکن قرض پر کسی نہ کسی طرح حل بھی ہو سکتی تھی، قرضخواہ کی پشتوں تک کی حجامت بغیر اجرت کے بنا کر کسی حد تک قرض کی ادائیگی ہو سکتی تھی اور پھر کلوا محنت مزدوری کر ہی لیتا تھا۔

کلوا کا دل شادی کے ذکر پر زور سے دھڑکا، مگر رحمتی کا نام سنکر دفعتًا رک گیا اُسے رحمتی سے نفرت تھی، اُس کی شکل سے اُس کی باتوں سے، اُس کی ہنسی سے چڑ تھی اُس کا بھرا بھرا گدار جسم دیکھ کر اُسے پھریری سی آجاتی۔ اُس کے دل میں عجیب سا احساس اُبھر آتا تھا جس کا وہ کبھی تجزیہ نہ کر سکا۔ شاید احساس نفرت، احساس کمتری شاید۔

وہ ایک ایسی لڑکی کو اپنی دلہن بنانا چاہتا تھا جس کی اُنگلی کے خفیف سے لمس سے اُس کے جسم میں بجلی سی دوڑ جائے چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ دوپٹہ کا شانہ سے ڈھلک جانا، دھند میں لپٹی ہوئی چٹانوں کے یک بیک نمودار ہونے کا مدہوش کن منظر پیش کر سکے، اور یہ رحمتی کہ اُس کا بہانے بہانے ڈھٹائی سے اُس سے لپٹ جانا اور دوپٹہ اوڑھے بغیر گھر بھر میں کبوتر کی طرح سینہ پھلائے پھرنا، اُس کے دل میں غصہ کے علاوہ کوئی دوسرا جذبہ پیدا نہ کر سکا تھا۔ اُسے رحمتی سے نفرت تھی بیحد نفرت، بڑھیا کے بے جان سے ہاتھ ہوا میں پھیل پھیل کر سپاٹ سینے پر پھسلتے ہی رہے، موت کو نت نئے طریقوں کی دعوت دیجاتی رہی۔ رحمتی کی آنکھوں سے بیک وقت آنسو اور شعلے برستے ہی رہے۔ مگر ان سب باتوں میں کلوا کو متاثر کرنے کی اہلیت حیرت انگیز طور پر معدوم ہو چکی تھی۔ وہ گویا کسی غیبی تحریک کے زیر اثر فاطمہ کے گھر پہنچا اور اپنی بات پکی کر لی۔

ماں کوس پیٹ کر خاموش ہو رہی، وہ جانتی تھی کہ راجہ کے من بھانے والی ہی رانی کہلائی ہے، مگر رحمتی کے دل میں جو انتقام کی چنگاری سلگ رہی تھی وہ بھڑک کر شعلہ بن گئی اور وہ تن دہی سے کلوا کی جڑیں کاٹنے میں منہمک ہو گئی۔

اور۔ کلوا کا کنوارا پن اُس کی کوششوں میں کامیابی کا ضامن تھا۔ وہ طبعًا نیک تھا، مختی اور کماؤ، اُسے لڑکی ملنی مشکل بات نہ تھی، وہ اتنا شرمیلا اور شریف تھا کہ آنکھ ملا کر بات کرتے ہوئے جھینپتا تھا، بزرگوں میں اُس کی یہ عادت پسندیدہ تھی کسی قسم کی بری صحبت میں اُس نے کبھی دلچسپی نہ لی تھی۔ اُس کے ساتھی ہر فن میں طاق تھے، اُسے بگاڑنے کی بھی اُنہوں نے ہر ممکن کوشش کر ڈالی۔ کوئی اور ہوتا تو منی بائی کی خوبصورت زہریلی نگاہوں اور دلفریب بیباک اداؤں سے بچ نکلنا اُس کے لئے ممکن نہ ہوتا، مگر دریا میں گھسنے کے باوجود اُس کے دامن کی خشکی، معجزہ ہی تو تھا، وہ وہاں بیٹھا ہوا اپنے ساتھیوں کو منی بائی اور اُس کی ہم پیشہ سہیلیوں سے کھُل کھیلتا دیکھتا رہا، دل میں ہلکی سی دھڑکن اور جسم میں خفیف سی جنبش ضرور ہوئی مگر دوسرے ہی لمحہ وہ ہلکے دل سے گراموفون پر رکارڈ پر رکارڈ بجاتا رہا۔

"فرشتہ ہے بابا یہ تو کوئی" اُس کے بعض ساتھیوں نے اپنے جسموں پر کہیں کہیں ابھرے ہوئے پھوڑے پھنسیوں کو چھپاتے ہوئے اپنی کمزوریوں کو کھوکھلے قہقہوں میں دفن کر دینے کی سعی کی۔

"کوئی بات تو ہے۔ ہاں نہیں تو ——" منی بائی ذومعنی انداز میں آنکھیں مٹکاتی ہوئی بیباکی سے مسکرائی۔

"ہی ہی۔ ہو ہو۔ واہ بائی جی کیا رگڑا ہے" وہ سب جی کھول کے کھلکھلائے، دوسروں کا درد اپنی تکلیف کا مداوا نہ سہی، کسی قدر تسلی کا باعث ضرور ہوتا ہے کہ صرف ہم ہی مبتلائے آلام نہیں ہیں۔ کلوا کے کلیجہ کو جیسے کسی نے برمی سے چھید دیا ہو۔ اُس کے دل میں خصوصیت سے غفور اسے، جس کا قہقہہ سب سے بلند تھا، خوفناک انتقام لینے کی خواہش

پیدا ہوئی۔ مگر وہ اُس کی اولین محبت کے مرکز فاطمہ کا اکلوتا بھائی تھا اور کلوا طبعاً نیک تھا محنتی اور رکؤا اپنے موروثی کام سے نمٹ کر، دو چار مختلف قسم کے اوزاروں سے بھری کسبت کو کیل پر ٹانگ کر وہ قریبی قصبہ کے اسٹیشن پر مزدوری کے لئے چلا جاتا تھا، مزدوری کی اوسطاً پانچ سات آنے پڑتی تھی اور وہ یہ پیسے اپنی دلہن کے واسطے جھانجن خریدنے کے لئے جمع کر رہا تھا۔ نہ جانے کب سے یہ جھانجن اُس کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے تھے، اُس کے محسوسات کو جگانے میں جھانجنوں کی موسیقی کے علاوہ کوئی دوسری شے مشکل ہی سے کامیاب ہوتی تھی، چھن، چھنن، چھن، جب نئی بیاہی ہوئی دلہنیں بغلوں میں گاگریں دبائے ہوئے قدم قدم پر فتنے جگاتی، کاجل آلودہ آنکھوں سے ڈھکے چھپے تیر چلاتی اور نوجوانوں کے سینے پر ہاتھ رکھکر "ہائے ظالم" کی صداؤں کو نظرانداز کرتے ہوئے، مترنم ہنسیاں بکھیرتی، جھانجن کی بین سی بجاتی ہوئی پنگھٹ پر جمع ہوتیں تو وہ اُن کے کالے کھُردرے، بڑے چھوٹے ہر نمونہ کے پاؤں کے گرد جگمگاتے ہوئے ہالے دیکھکر سب سے زیادہ متاثر ہوتا، وہ اس نظارہ کا بچپن سے عادی تھا اور شاید یہی وجہ تھی کہ دلہن اور جھانجنوں کا تخیل اُس کے ذہن میں ساتھ ساتھ آتا تھا، دونوں چیزیں ایک دوسرے کے بغیر بیکار اور نامکمل تھیں، دلہن کی حیثیت سے کوئی خاص لڑکی اُس کے دل پر قابض نہ تھی، فاطمہ، ننھی، زینب، آمنہ، اور بسم اللہ ——— اور باقی وہ سب لڑکیاں بھی جن سے اب تک اُس کے رشتہ کی بات چیت نہ چلی تھی سب سے اُسے یکساں محبت تھی، اُس نے ہر ایک کے فراق میں آہیں بھری تھیں، چھپ چھپ کے نہیں، ہر ایک کو درد دل سنا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رویا بھی تھا، ہر فرد اُس کی تباہی کی داستان پوری توجہ اور دلچسپی سے سنتا، اکثر جن میں زیادہ تعداد جوان بیواؤں، بوڑھے شوہروں کی کمسن بیویوں اور اُن بوڑھوں کی تھی جن کے چلم تماکو کا وہ کفیل تھا، اُس کی تباہی پر اظہار تاسف کرتے، اُس کے بدتمیز بیہودہ اور بجس سا تھی غنڈوں کی طرح اُس پر فقرے کستے اور چنچل چھوکریاں مُنھ میں آنچل دبا کر ہنسی روکتیں، وہ ہر ایک کو اپنی داستان غم سے متاثر پاکر اور روتا ——— بہت سیدھا تھا وہ اور اُس کے دل میں یہ احساس موجود تھا کہ وہ بہت اچھا ہے اور دوسرے بھی اُسے اچھا سمجھتے ہیں، پھر گاؤں کی بہتر سے بہتر لڑکی ملنے میں اُسے کیا دقت ہو سکتی تھی۔ فاطمہ سے اُس کے پیام کو بہت احترام اور قدر کی نظروں سے دیکھا گیا اور شادی کی تیاریاں ہونے لگیں، اور وہ چھوارے اور سہاگ پڑے ہری مہندی ——— خیر۔ مگر ایک دن اچانک فاطمہ کے ماں باپ نے غفورا سمیت اُس کے گھر پر دھاوا بول دیا۔

"دھوکا ـ وہ بھی ہمارے سنگ ـ سالا دگا باج ـ گیا تھا شہر کمائی کرنے بمشکل سے ہی باولا دکھی ہے سسرا"

دونوں ماں بیٹے ہونقوں کی طرح مُنھ تک رہے تھے، وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکے اور رحمتی آنچل کو گھونگھٹ کی طرح ماتھے پر سرکاتے ہوئے، پکا پکا سہما ہوا سا منھ بنائے چمٹے سے چولھے کی راکھ کرید رہی تھی۔ فاطمہ کی ماں عورت تھی نسبتاً معدل، اُس نے ان لوگوں کو شش و پنج میں کھنا مناسب سمجھا، دوسرے وہ جلدی وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی وہ سہمی ہوئی تھی اور غفورا کے پیچھے چھپی جا رہی تھی۔

"تو نے کاہے چھپایا ری، ڈاگدر جی نے کیا کہا؟ سہر جا کے ایک بیری لگ کے دوا کرا لے، پیسے کا کا ـ ہاتھ کا میل ہے ـ ہے ہے کا گبرو جوان" اُس نے ہاتھ ملتے ہوئے کلوا کی طرف دیکھا اور جلدی سے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔

کلوا معاملہ کو سمجھتا جا رہا تھا، اُس کا چہرہ بھیانک ہو گیا، آنکھیں شدت غضب سے ابل آئیں اور قرائن سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کوئی خطرناک عزم کر چکا ہے۔

"تیرے مریں یار ـ پیاروں پیٹی" کلوا کی ماں نے غصہ میں جھنجھلا کر غفورا کی ماں کو ایسی گالی دی جس کی قبولیت کا امکان نہ تھا، وہ یاری کی حد سے متجاوز ہو چکی تھی، غفورا کی ماں زیادہ وزنی گالی لوٹانے میں کامیاب ہو گئی تھی

کہ کلوا نے رحمتی کے ہاتھ سے چمٹا اس طرح جھپٹ لیا کہ ابھری ہوئی کیل سے رحمتی کا ہاتھ لہولہان ہوگیا۔

"اب بول حرامجادی" ۔ اُس پر گویا بھوت سوار ہوگیا، وہ دیوانوں کی طرح چمٹا بجاتا ہوا غفورا کی ماں کی طرف لپکا جس کی تصور میں ساس کی حیثیت سے وہ بارہا خدمت کرچکا تھا۔

"ارے باپ رے" غفورا کے ہاتھ سے خوف کے مارے لاٹھی چھوٹ گئی اور وہ ایک دوسرے کی پروا کئے بغیر گرگر کے سنبھلتے اور سنبھل سنبھل کر گرتے پڑتے بھاگ نکلے، بڑھیا دیر تک بڑبڑاتی رہی، غالباً وہ کوس رہی تھی، فاطمہ کے خاندان کو کم اور کلوا اور اپنے نصیب کو زیادہ ـــــ کلوا نے ہوش میں آکر سوچا کہ یہ سب کچھ کیوں ہوا۔ وہ پاگل تو نہ تھا اور فاطمہ کے گھر والوں میں بہت مقبول تھا، یہ سب کچھ کیسے ہوُا، وہ سمجھ نہ سکا۔ ہاں ایک دن پہلے رحمتی فاطمہ کے گھر سے نکلتی ہوئی دیکھی گئی تھی۔

اور اُس واقعہ کے بعد رحمتی کی کاوشوں کی چنداں ضرورت نہیں رہی، سب کچھ خود بخود اُس کی مرضی کے مطابق ہوتا رہا۔ رحمتی خود کلوا کا پیغام لیکر جاتی اور وہاں ہم سن چھوکریوں سے گپ لڑانے میں اس درجہ مستغرق ہو جاتی کہ اُسے کلوا کے متعلق یاد ہی نہ رہتا۔ چلتے چلاتے سرسری طور پر ذکر نکالتی اور اس طرح کلوا کی تعریفیں کرتی کہ ذم کا پہلو غالب رہتا، خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہونے پر روتی بسورتی اور کوستی پیٹتی کلوا کی چارپائی پر اس طرح جا پڑتی کہ اُس کا بالائی حصۂ جسم اُس کے گھٹنوں سے ذرا اوپر جا ٹکتا، مگر وہ اُس کا گھر بسانے کے لئے اُس کی بے غرض اور انتھک کوششوں کے احترام کے باوجود اُسے بیزاری سے ڈھکیل دیتا۔

آخرکار ـــــ ناکامیوں اور مایوسیوں کی تاریک بدلیوں میں گھرا ہوا کلوا سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ رحمتی اتنی بڑی تو نہیں، جیسا کہ وہ سمجھتا رہا، ٹھکرائے جانے کے باوجود وہ اُس کے آرام کا کتنا خیال رکھتی ہے، کلوا کی خاطر اُس نے کس کس کے در کی خاک نہیں چھانی ۔ یہ اُس کی قسمت تھی کہ کہیں کام نہ بن سکا۔ مگر کوئی ایسی قربانی کسی کو کئے کر تو دے ۔ دوسرے ماں میں اب رکھا ہی کیا ہے ۔ جینے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے آخر۔ اُس کے بعد رحمتی نے دوسرا گھر کرلیا تو ـــــ وہ کیسے جئے گا ۔کون اُس کے کھانے پینے کا خیال رکھیگا ۔ اُس کے کپڑوں کو سدھاریگا زمانہ کی بدسلوکی کا حال کسے سنا کر وہ تسکین حاصل کریگا ۔ اس وسیع دنیا میں کسی ساتھی کے بغیر کیسے زندگی کی بوجھل گاڑی کھنچ سکے گی اور بڑے بڑے جھانجنوں کی رنگت بھی سبزی مائل ہوچکی ہے ۔

"کا کرے ہے رہی ۔ تنک ہمارے پاس بھی آبیٹھا کر" رحمتی اس پیار بھرے غیرمانوس لہجہ سے چونکی ۔ مگر پھر ایک ٹھنڈی سانس لیکر کام میں مصروف ہوگئی، اُسے اپنی خوش قسمتی پر اعتبار نہ آیا، ہمیشہ سراب سے دوچار ہونے والے پانی کو بھی چمکتی ہوئی ریت سمجھ بیٹھتے ہیں ۔ مگر جب کلوا نے آرزومند نگاہوں سے اُسے دیکھتے ہوئے، اور بھی پیار سے پکارا تو وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے سراپا سپردگی بنی ہوئی اُس کے پاس آبیٹھی اُس کا تنفس تیز ہو رہا تھا اور آنکھیں شرابیوں کی مانند چڑھی ہوئی تھیں، کلوا کو اس وقت وہ بہت بھلی معلوم ہوئی ۔ اُس نے گویا فیصلہ کرلیا کہ وہ اُس کی جوان آرزوؤں اور گھٹی ہوئی امنگوں کا جی کھولکر خیر مقدم کریگا، رحمتی نے لمبی لمبی سانسوں کے درمیان اپنے جسم کا سارا بوجھ اُس کے شانوں پر ڈالدیا۔ اس کے اعصاب میں ہیجان سا پیدا ہوا، دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ آنکھوں کی پتلیاں تیزی سے حرکت کرنے لگیں، مگر لمحہ بھر کے بعد بالکل سکون تھا۔ وہی پہلے کا سا جمود اور اب اُس کی آنکھوں میں درد و یاس اور بےبسی کی گہری کیفیت نمایاں تھی۔

گلی میں سے مارکٹائی، شور و غل کی عجیب سی آوازیں آنے لگیں۔ شاید کسی ۔ اگیہ نے (ملاحظہ ہو باقی صفحہ ۳۲ پر)

رشدی

چمپا گلی

آخرکار اس نے فیصلہ کر ہی لیا، ——— اب اس کے سامنے چمپا گلی تھی جہاں وہ بیس سال سے رہتی تھی۔

اُس نے اپنے پہچانے ہوئے راستہ پر ایک پُراشتیاق نظر ڈالی اور اپنے پرانے ساتھیوں کو پہچان لیا چھوٹے بڑے پختہ مکانات جن کی سفیدی زردی میں تبدیل ہو چکی تھی، ابھی تک دوش بدوش کھڑے ہوئے ایک دوسرے کو گھور رہے تھے ——— اور پیپل کا پُرانا درخت کالی کے مندر کے چبوترے کے گرد بدستور سایہ فگن تھا۔

کملا جیسے ہی افسردہ اور نڈھال مندر کی طرف بڑھی اظہارِ عقیدت کے طور پر اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر دیوی کے سامنے سر جھکا دیا، وہ آگے بڑھی جا رہی تھی۔ چمپا گلی میں کچھ نئی چیزیں نظر آ رہی تھیں اور کچھ کی کمی محسوس ہو رہی تھی، اسے خیال آیا کہ اس کے بہت سے ساتھی بچھڑ گئے ہیں، جنھیں وہ ایک عرصے سے جانتی تھی۔ نہ تو یہاں کسی قسم کی نقل و حرکت نظر آ رہی تھی اور نہ زندگی کی سرگرمیاں! اسے چلتے وقت راستہ میں آوارہ گایوں کو دھکا دیکر ایک طرف ہٹانا پڑتا تھا۔ اور بھونکتے ہوئے کتوں کو تو وہ بار بار جھڑکتی تھی، آج یہ سب کچھ نہ تھا، زندگی کی گھما گھمی ایک طویل سکوت میں دب گئی تھی، حتّٰی کہ کالی بلّی کا بھی کوئی نشان نہ تھا جس سے اسے یہ خطرہ لگا رہتا تھا کہ کہیں راستہ کاٹ کر بدبختی کا سامان نہ پیدا کر دے۔

ایک اونچی دُکان کے سامنے کملا اچانک رک گئی۔ یہ بسنت لال کا گھر تھا۔ جب سے وہ چمپا گلی میں آئی تھی بسنت لال اس کا مہاجن تھا اور وہ یہاں سے گزرتے وقت اس سے مقامی حالات کے بارے میں ضرور تبادلۂ خیالات کرتی تھی، اب وہ کہاں چلا گیا؟ اس نے بنیے کے ہمسایہ رام نرائن کو تلاش کیا جو پان بیچا کرتا تھا۔ جہاں وہ زمرّدی پان لینے کے لئے ہمیشہ رکا کرتی تھی، مگر آج نہ تو وہ موجود تھا اور نہ اُس کے زمرّدی پان!

"للّو" اس نے اس امید میں آواز دی کہ کوئی تو ضرور بولیگا۔ مگر کسی نے جواب نہیں دیا۔ اس نے اپنی حماقت پر افسوس کیا کہ کسی کو بغیر دیکھے ہی آواز دیدی۔

مٹر کی پھلیاں اور مٹھائی بیچنے والا وہ بوڑھا بھی آج لاپتہ تھا جس کو دن بھر بچے گھیرے رہتے تھے۔

سراسیمگی اور پریشانی کے عالم میں اس نے اندازہ لگایا کہ گلی میں کوئی نہیں ہے، بچوں کی آوازیں اور ان کے قہقہے جن سے دن بھر گلی گونجا کرتی تھی خاموش تھے، ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا اور وحشت سی برس رہی تھی، دور تک رکشا کی گھنٹی کی آواز بھی منجمد ہو گئی تھی، اس کی بےچینی بڑھتی جا رہی تھی۔ اب تک وہ حیرت میں ڈوبی ہوئی کلکتہ کی سڑکوں پر گھوم رہی تھی۔ اب اس کی آنکھوں نے ایک نیا ہی نقشہ دیکھا، وہ واپس چمپا گلی میں آ گئی، ہر چیز اس کے سامنے صاف تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ یہ قحط کی تباہ کاریاں ہیں جس کے مہلک شرارے، انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار رہے ہیں۔

کملا مندر کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی اس کا تصورِ ماضی کا جائزہ لینے لگا۔ وہ اب سے ۲۰ سال قبل چمپا گلی میں آئی تھی۔ اسوقت تک وہ کلکتہ کے عظیم الشان شہر سے دور ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتی تھی۔ اس نے گھر سے

باہر اس وقت قدم نکالا جب اُس کی شادی کمار سے ہوئی جو کلکتہ میں کاروبار کرتا تھا۔

اس وقت وہ پندرہ سال کی تھی، شادی کا خیال اُس کے لئے بہت ہی ڈراؤنا اور عجیب تھا۔ وہ ایک عرصہ سے کمار کو جانتی تھی اور اُسے کئی بار دیکھا بھی تھا، مگر اس نوجوان کا اس کے دل پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ شادی سے پہلے سے کمار سے کوئی لگاؤ ہی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اور جب اِس کے ساتھ شادی ہوگئی تو اچانک کملا کو پتہ چلا کہ وہ گاؤں کے تمام لوگوں کا مرکز توجہ بن گئی ہے، جو شادی سے قبل اس سے ذرا بھی دلچسپی نہیں لیتے تھے، لیکن جب سے انھیں یہ معلوم ہوا تھا کہ اس کی شادی کلکتہ میں ہو رہی ہے، جہاں اس کے "دولہا" کی ایک بڑی دکان ہے جس کی صاحب لوگ سرپرستی کرتے ہیں تو وہ ....

کملا کو بہت خوش قسمت سمجھتے، اور حیرت سے اسے دیکھتے، اس کی بڑی بہن نے بتایا تھا کہ شادی بڑا کٹھن مرحلہ ہے اور پھر ماں بننے میں جس کرب و ابتلا کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس کا اظہار کسی طرح ممکن ہی نہیں۔ شادی کی پُرکیف تقریبات میں کملا نے ان سب چیزوں کے خوف کو بھلا دیا۔ سب سے بڑھ کر خوشی اسے یہ تھی کہ وہ کلکتہ جا رہی ہے۔ اس نے اس شہر کے متعلق بہت کچھ سن رکھا تھا۔ اور ایک عرصہ سے وہ اس "جادو کے شہر" کے خواب دیکھ رہی تھی، شادی کے دن بھی وہ اس خیال میں تھی کہ اسے نئی نئی چیزیں دیکھنے کو ملیں گی۔ اس نے ناچ گانے کی طرف کوئی توجہ نہیں کی، حتّٰی کہ پنڈت کے منتروں کو بھی اس نے نہیں سنا۔ اس نے اپنی ماں کے ان آنسوؤں کا بھی کوئی خیال نہیں کیا جو اس کی بیٹی کے کمار سے بندھن کے وقت بے اختیار نکل پڑے تھے ــــ وہ بندھن جسے صرف موت ہی توڑ سکتی ہے۔ جب وہ، کمار اور اس کا بھائی ٹرین میں سوار ہوئے تو اُسے یہ احساس ہوا کہ وہ اپنے گاؤں سے رخصت ہو رہی ہے، وہ ایک ایسے شخص کے ساتھ جا رہی تھی جو اُس کے لئے ایک اجنبی کی حیثیت رکھتا تھا، وہ ایسے گھر میں جا رہی تھی جہاں اسے اکثر تنہا رہنا پڑیگا۔ کمار کے والدین عرصہ ہوا چل بسے تھے اور وہ دن بھر دکان پر رہا کریگا، اس قسم کے خیالات سے اُس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ کمار نے اسے تسلی دی، اس اجنبی کو اسے چھونے کا کیا حق ہے؟۔

جب وہ کلکتہ پہنچے تو کملا کا جوش پھر بڑھ گیا۔ اسے یہ سب اچھی طرح یاد آگیا ــــ جب وہ ایک پرانے طرز کی فٹن میں سوار ہوئے تو اس نے حیرت سے بجلی کے لیمپوں اور لوگوں کے ہجوم پر نظر جما دی، اس نے آج تک اتنے آدمی نہیں دیکھے تھے۔ کاریں ہارن بجاتی ہوئی گذر رہی تھیں، ٹراموں اور بسوں کی نقل و حرکت اس کے لئے بہت ہی تعجب خیز تھی۔ فلک بوس عمارتیں اس کے دماغ کو چکرا رہی تھیں، جب وہ ایک تنگ راستے کی طرف مڑے تو اُس کے شوہر نے کہا "یہ چمپا گلی ہے، یہیں ہمارا گھر ہے ــــ"

اس نے چاروں طرف دیکھا مگر کہیں اسے چمپا کا درخت نظر نہیں آیا، اسے صرف ایک پیپل کا درخت دکھائی دیا جو کالی کے چھوٹے سے مندر کے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس نے دیوی کی طرف دیکھکر اپنے دونوں ہاتھوں کو تعظیماً جوڑ دیا ــــ اور وہ اپنے گھر میں داخل ہوگئی۔

ــــ اس طرح اُس کی ازدواجی زندگی شروع ہوئی۔

تین سالہ بچی کا بوجھ اس کے لئے بہت سخت تھا، لیکن وہ بچی کو اپنے جسم سے علیحدہ نہیں سمجھ رہی تھی، وہ اس کو اتنی دیر سے لئے ہوئے تھی کہ وہ بھی اس کا جزو لاینفک بن گئی تھی، دو دن سے پرمیلا اس کی گود میں تھی، اس وقت سے کمار خوراک کی تلاش میں گیا ہوا تھا اور رمیش بھی اس کے پیچھے چلا گیا تھا، اب وہ بالکل اکیلی تھی، وہ واپس نہیں آئے تھے

اس لئے وہ باہر اس فکر میں نکلی تھی کہ ممکن ہے کہ کہیں نہ کہیں سے اسے اور بچی کو کچھ کھانے کو ملجائے اور کمار یا اس کا بیٹا ہی کہیں نظر پڑ جائے۔ لیکن کملا کو کچھ نہ ملا، وہ دن اور رات سے بھٹکتی پھر رہی تھی، اُس کو اپنی ہی طرح ہزاروں بھوکے نڈھال اور محتاج ملے، وہ انسان معلوم نہیں ہوتے تھے وہ ایک دوسرے کے چہرے پر نظر نہیں ڈال سکتے تھے، اس نے کچھ کھانے کا سامان خریدنے کی کوشش کی، مالدار حلقوں میں کچھ دکانیں بھری ہوئی معلوم ہوتی تھیں مگر اس کی نقرئی چوڑیوں سے کچھ زیادہ نہیں خریدا جا سکتا تھا، آخر وہ تکان سے چور ہو کر لاشوں کے ڈھیر کے قریب ہی لیٹ گئی۔

اس نے آج صبح طے کر لیا تھا کہ اگر اسے مرنا ہی ہے تو وہ کالی کے مندر سے واپس جائیگی جہاں وہ یہ دعا مانگیگی کہ آئندہ جنم میں وہ اور اُس کا خاندان یا تو خوشحال ہو یا پھر جنم ہی نہ لے، ہاں اسے آخری بار پھر کالی کے مندر میں جانا چاہئے۔ اگرچہ کالی نے انھیں بھوکا مارا ہے، مگر وہ یہ دعا ضرور کریگی کہ گھر پر کمار اور اس کا بیٹا صحیح سلامت ملجائیں۔

رمیش اور کمار ——— کبھی وہ انھیں دوبارہ زندہ دیکھ سکیگی؟

اس نے سڑک پر نظریں گاڑ دیں، کیا وہ بیوہ ہو کر مریگی، ایک نیک ہندو بیوی جس نے ہمیشہ یہ دعا کی ہو کہ اس کا کریا کرم کمار کے ہاتھوں ہو؟ کیا وہ اس شخص کو بھی دیکھ سکیگی جو ۲۰ سال پہلے اس کے لئے اجنبی تھا اور وہ اب اُس سے محبت کرتا تھا اور اس کے بچوں سے گھر کی حالت ہی بدل گئی تھی، جب وہ شام کو دکان سے آتا تو وہ مسکراتی ہوئی نظروں سے اس کا خیر مقدم کرتی اور وہ دونوں بھجن میں شامل ہونے کے لئے مندر جاتے، کھانا کھا چکنے کے بعد وہ آنیوالے بچہ کے بارے میں باتیں کرتے اور دعا کرتے کہ وہ لڑکا ہو۔ اور جب لڑکا پیدا ہوا تو وہ کالی کے مندر میں اظہار عقیدت کے لئے گئے۔

ان دنوں کملا بہت مصروف رہتی شام کو وہ دونوں رمیش سے دل بہلاتے اور اُس کے چہرے پر اپنے خدوخال تلاش کرنے کی کوشش کرتے۔ بعد کے دو بچے مر گئے، لیکن کمار اور کملا برابر قانع رہے۔

——— وہ آہستہ آہستہ سیڑھیوں پر سے اُٹھی اور اس چبوترہ کی طرف بڑھی جہاں کالی کی مورتی نصب تھی۔ اس نے پرمیلا کو اپنی گود سے الگ کر کے فرش پر لٹا دیا اور اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر کالی کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"ماتا!" اس نے سسکی بھرتے ہوئے کہا "مجھے بیوہ کی موت مرنے سے بچا لو، مجھے میرا خاوند واپس دیدو، مجھے میرا لڑکا دیدو، مجھے کچھ کھانے کے لئے دیدو، اگر ہم میں سے کسی نے کوئی گناہ کیا ہے اس کا بدلہ مجھ سے لے لو۔ کمار رمیش اور میری بچی کو بچا لو، اگر کسی کی موت آئی ہے تو مجھے دیدو! مجھے ایک مرتبہ اپنے گھر جا کر اپنے خاوند اور بچہ کو زندہ دیکھ لینے دو، میں انھیں تمھاری حفاظت میں چھوڑ دونگی، انھیں آفت سے بچا لو، کالی ماتا! میری یہ استدعا سن لو۔ اگر میں نے اور میرے خاندان نے کوئی گناہ کیا ہے تو اُس کی سزا مجھے دیدو"

وہ دوزانو ہو گئی اور اپنا سر زمین پر رکھ دیا اور پھر اُٹھ کر اپنی بچی کو گود میں لے لیا اور مورتی کے چرنوں میں پڑے ہوئے ایک پھول کو اُٹھا لیا اور اُس کو پرمیلا کی پیشانی اور اپنے سر سے لگایا۔

آہستہ آہستہ وہ مندر کی سیڑھیوں سے نیچے اتری اور امید کا سہارا لیکر گھر کی طرف قدم بڑھایا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کیا کالی اُس کی دُعا کو قبول کریگی، کیا اس کا شوہر اور بیٹا گھر پر ملجائیگا۔

اسے درمیان میں ایک جگہ رکنا پڑا وہ بہت تھک گئی تھی اس کی روح تک کچل گئی تھی۔

رمیش کتنا اچھا تھا، اُسے کتنی محبت سے اسنے پالا پوسا تھا، وہ دروازہ کے سامنے ٹھہر گئی۔

اس کو وہ دن یاد آگیا جب رمیش میٹرک کے امتحان میں کامیاب ہو کر خوشی سے اُچھلتا ہوا دوڑ کر اس کے پاس آیا تھا "ماں! میں پاس ہو گیا" اور رمیش کو پیار کیا تھا اور اُس سے کالی کا شکرانہ ادا کر دیا تھا۔

شام میں جب کمار گھر آیا تو وہ بھی بہت خوش ہوا اور سب کے سب کالی کے مندر گئے تھے اور برہمنوں کو خیرات دی تھی۔ انھیں فخر تھا۔ کیونکہ قرب وجوار میں بہت ہی کم لڑکوں نے میٹرک پاس کیا تھا۔ لیکن جب وہ مندر سے گھر پہنچے تو اچانک صورتحال بدل گئی۔ کھانے کے بعد کمار نے کہا "بیٹا! اب تم نے اپنی تعلیم ختم کر لی ہے، اب دکان میں میرا ہاتھ بٹاؤ، تمھاری وجہ سے مجھے بڑی مدد ملیگی، بعض دفعہ میں انگریزوں کی بات نہیں سمجھ سکتا کہ وہ کیا مانگتے ہیں۔ مجھے امید ہے، تم اس کاروبار کو زبردست ترقی دے لوگے"

کملا کو جو میش کی طرف دیکھ رہی تھی ایسا معلوم ہوا جیسے رمیش کی ساری مسرت چھین لی گئی ہو۔ اُس کی گردن جھک گئی۔ وہ خاموش رہا، کملا نہ سمجھ سکی کہ باپ کے ان الفاظ سے وہ کیوں اس قدر غمگین ہو گیا، کمار کو بھی لڑکے کی خاموشی سے تعجب ہوا۔

"کیا بات ہے؟ تم نے گردن کیوں جھکا لی اور بولتے کیوں نہیں، تم نے ابھی امتحان پاس کیا ہے اور اب روزی کمانا شروع کروگے، تمھیں خوش ہونا چاہیئے" کمار نے کہا۔

رمیش نے افسردگی کے ساتھ، ایک چہرہ کی طرف سے دوسرے کی طرف دیکھا اور پس وپیش کے بعد بولا "پتا جی! میں ابھی دکان پر جانا نہیں چاہتا، میرا ارادہ" ——— اور کملا نے دیکھا کہ وہ اُس کی طرف آرزومند نظروں سے دیکھ رہا ہے "یہ ہے کہ میں کالج جاؤں، اس کے بعد آپ کا ہاتھ بٹاؤں"

"کالج جاؤگے؟" کمار نے حیرت سے پوچھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کبھی اُس کو یہ خیال آیا ہی نہیں۔

"تم کالج کیوں جانا چاہتے ہو؟ تم میٹرک پاس کر چکے، کیا یہ کافی نہیں؟"

"پتا جی آپ جانتے ہیں" رمیش نے ملتجیانہ انداز سے کہا "میرے تمام ٹیچروں کا کہنا ہے کہ مجھے کالج ضرور جانا چاہیئے اور میں خود بھی جانا چاہتا ہوں، میں نے ابھی پڑھا ہی کیا ہے، مجھے آگے بڑھنا ہے۔ ایک نئی دنیا ———"

ماں باپ میں سے کسی نے کچھ نہیں کہا، وہ کچھ نہیں سمجھ سکی کہ رمیش کیا کہنے کی کوشش کر رہا ہے، مگر اُس نے رمیش سے ہمدردی کا ضرور اظہار کیا، وہ جو مانگتا ہے اُسے ملنا چاہیئے، کیا وہ ان کا اکلوتا بیٹا نہیں ہے۔

"پتا جی!" رمیش نے خاموش فضا میں سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونا بہت اچھا ہے۔ ابھی مجھے بہت سی باتیں سیکھنا ہیں، پتا جی کیا میں کالج نہیں جا سکتا"

کملا نے کمار کی طرف پُر امید نظروں سے دیکھا، اسے امید تھی کہ کمار مان جائیگا۔ اگرچہ وہ رمیش کی باتوں کو نہیں سمجھ سکی تھی، وہ صرف یہ جانتی تھی کہ اس کا بیٹا کچھ مانگ رہا ہے اور اُسے معلوم تھا کہ اس علاقہ میں کوئی لڑکا کالج نہیں جاتا، مگر کمار کے چہرے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی بات پر جما ہوا ہے۔

"کالج سے فارغ ہونے کے بعد تم کیا کروگے؟ صرف یہی خیال تمھارے دماغ میں بیٹھ جائیگا کہ کہیں کلرک بنجاؤں ——— ظاہر ہے کہ ہر صورت میں بھوکا ہی مرنا پڑیگا، میں بھی اسکول یا کالج نہیں گیا، پھر بھی تم نے کما رہا ہوں میں نے تمھیں پڑھایا ہے اب تم ویسا ہی چاہتے ہو؟" ... نے رمیش کی طرف دیکھا، اور حتمی طور پر کہا "نہیں، بس تم رہنے دو، حماقت خیز دنیا پر روپیہ برباد نہیں کر سکتا" یہ کہہ کر وہ باہر چلا گیا۔

کملا نے بے چینی کے ساتھ رمیش کو دیکھا وہ بیٹے کو خود بے بس پا رہی تھی، رمیش نے اپنا سر اور نیچا کر لیا جیسے وہ اپنی مایوسی اور ناکامیوں کو چھپا رہا ہو، اسے خبر نہیں تھی کہ کملا اس کی باتوں کو سمجھے بغیر بھی اس سے ہمدردی کر رہی تھی، کملا سوچ رہی تھی کاش وہ اور کمار اسکول گئے ہوتے، اُس وقت وہ لڑکے کی امنگوں کو سمجھ سکتے۔

چنانچہ اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا رمیش چلا گیا تھا۔ وہ کہاں جا سکتا ہے؟

شاید وہ اپنے کمرہ میں گیا ہوگا۔ اسے میز کی دراز کھلنے کی آواز آئی جہاں بیٹھکر وہ اسکول کا کام کیا کرتا تھا، وہ فوراً اٹھکر اس کے پاس گئی۔

رمیش اپنی میز کے قریب کھڑا تھا، اس کی نظریں کاغذ کے ایک فارم پر جمی ہوئی تھیں —— اس نے رمیش کو آواز دی، مگر وہ نہیں بولا، اس نے آہستہ آہستہ دیدہ و دانستہ کاغذ کے پرزے پرزے کر دیئے اور انہیں زمین پر بکھیر دیا، اس نے کہا "یہ میرا میٹرک کا سرٹیفکٹ ہے، اب مجھے اس کی ضرورت نہیں، کیونکہ اب مجھے کالج کے بجائے پتاجی کی دکان پر جانا ہے"

کملا کچھ نہیں بولی —— وہ ابھی تک الگ کھڑا تھا —— کیا وہ بات بھی نہیں کریگا۔ رمیش نے ماں کو مضطرب دیکھا تو اس کی گردن میں باہیں ڈالدیں، "ماں میں کالج جانے کے لئے کس قدر بیتاب ہوں، کیا تم نہیں جانتیں یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ میں جسوقت کھانے کے لئے آگے بڑھوں تم میرے سامنے سے اسی وقت کھانا اٹھالو۔ میں اب بھوکا مر رہا ہوں"

کملا سمجھ گئی، اب وہ اس کی تمام باتیں سمجھ سکتی تھی، رمیش کا غم اس کا غم بن گیا، اس نے پیار سے اس کو بٹھایا، وہ اسکو کالج ضرور بھیجے گی۔

"اچھا اب تم جاکر سو جاؤ —— کل سب کچھ ٹھیک ہو جائیگا، کالی سے دعا کرو، میں تمہارے پتاجی سے کہونگی، اب میں جا رہی ہوں، پرمیلا رو رہی ہے"

اس نے کمار سے ایک لفظ نہیں کہا، جب وہ بستر پر چلا گیا تو وہ اس کے پائنتی جاکر بیٹھ گئی۔

"میں نے آجتک تمہاری کسی بات سے سرتابی نہیں کی لیکن آج پرماتما معاف کرے، میں تم سے متفق نہیں" کملا نے گفتگو شروع کرتے ہوئے کہا "تم نے رمیش کو کالج بھیجنے سے انکار کر دیا ہے، لڑکا اس کے لئے بیچین ہو رہا ہے اگر ہم نے اس کا کہنا ٹالا، یا تو وہ ہم سے ہمیشہ کے لئے برگشتہ ہو جائیگا، میں نہیں جانتی کہ کالج کیوں اسقدر اہم ہے، لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ برا بھی نہیں ہے، تم ہی سوچو آج جب میٹرک کا سرٹیفکٹ لیکر آیا تو ہم نے کس قدر فخر کیا تھا۔ غور کرو جب وہ کالج سے ڈگری لیکر آئیگا تو ہم کتنا رشک کریں گے؟"

اس نے پوری قوت سے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "میں سمجھتی ہوں شاید تم اسلئے کالج نہیں جانے دیتے ہو کہ وہ ہم سے زیادہ عالم بننا چاہ رہا ہے"

کمار کے احتجاج کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس نے کہا "تم نے بغیر کسی مددگار کے دکان کے کام کو اب تک آسانی سے چلایا ہے، تم چار ایک سال اور کاروبار کو بخوبی انجام دیتے رہوگے، وہ ہمارا اکلوتا بیٹا ہے، اگر روپئے کا سوال ہے تو میں تمہیں اب تمام زیورات دینے کے لئے تیار ہوں، جو مجھے جہیز میں ملے ہیں، تم انہیں بیچ کر قیمت کرلو، یہ میں نے اس کی دلہن کو دینے کے لئے رکھ چھوڑے تھے، [illegible] کچھ خرید لینگے"

[illegible] وہ رات گئے تک [illegible] راضی ہو جانا ہی پڑا، وہ خوش خوش اٹھی اور رمیش کے کمرہ میں پہنچی جہاں وہ نیند میں اپنی [illegible] خواب دیکھ رہا تھا۔

[illegible] اس نے سنا تھا، وہ رمیش سے [illegible] مگر کوئی توجہ دیئے بغیر [illegible] اس نے بہت سی چیزیں دیکھی تھیں، ایک گھر [illegible] میں اتنی سکت بھی نہ تھی کہ خود اس کی تلاش میں نکل سکیں، انہوں نے گھر [illegible] آہستہ آہستہ وہ مکان کی طرف بڑھی، تیز تیز قدم

وہ اپنے دروازہ پر پہنچی۔ شاید وہ آگئے ہونگے اندر سو رہے ہونگے، بےچینی کے ساتھ وہ اپنے کمرہ کی طرف پہنچی۔ کمرہ خالی دیکھکر اُس کی امیدیں مرجھا گئیں۔ شاید وہ رمیش کے کمرے میں ہونگے، نہیں وہ بھی خالی تھا، اب صرف باورچی خانہ رہ گیا تھا جو کھانے کے کمرے کا بھی کام دیتا تھا، وہ لوگ وہاں بھی نہیں تھے۔ وہاں جاتا بھی کون جبکہ کئی روز سے چولہے میں آگ بھی نہیں جلی تھی، وہ اپنے کمرے میں واپس آگئی اور پرمیلا کو نیچے لٹا دیا اور خود انتظار کرنے لگی ——— شاید وہ لوگ واپس آجائیں، تکان سے اس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ اسے بھوک پیاس سے مرد، عورتیں اور بچے ان سڑکوں پر بھٹکتے ہوئے نظر آرہے تھے جہاں وہ خود بھی گھومتی رہی تھی وہ سڑک کے کنارے اس طرح گر پڑتے تھے جیسے درخت سے سوکھے پتے اور لاشوں کے انبار پر انبار لگ رہے تھے۔

اچانک یہ بھیانک شہر اُس کی نظروں کے سامنے سے غائب ہوگیا۔ اس نے دیکھا کہ کمار اور رمیش اس کو دیکھکر مسکرا رہے ہیں اور موت کا دیوتا یم ان کے ساتھ ہے، اُنھوں نے اس کو اپنے ساتھ آنے کا اشارا کیا ———

اور وہ ایک جھٹکے کے ساتھ نیند سے چونک پڑی۔ وہ اپنے لڑکے کو پکارتی ہوئی دروازہ کی طرف بڑھی، اس نے پہلی مرتبہ کمار کا نام لیکر پکارا، لیکن اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ مایوسی، حسرت اور اضمحلال کے ساتھ اس نے گلی کی طرف دیکھا ——— لاشوں کے ڈھیر بر گتے مرے ہوئے پڑے تھے، اسے کوئی جاندار چیز نظر نہیں آئی۔

کیا کالی اس کو آخری دعا بھی نہیں کرنے دیگی؟۔ اسے پھر مندر جانا چاہیئے، وہ لڑکھڑاتی ہوئی دیوار کے سہارے اُٹھی، جیسے ہی اس نے قدم اُٹھایا لڑکی کے رونے کی آواز آئی "ماں!" ——— اور اُس کا سر چکرا گیا۔ اس کو لاشوں سے اٹا ہوا ایک گڑھا نظر آیا، جہاں سب سے اوپر اُس کے شوہر اور لڑکے کی لاشیں پڑی تھیں۔

"میں آرہی ہوں" اُس نے چیخکر کہا۔

"میں آرہی ہوں" اور وہ پتھریلی سیڑھیوں پر دھم سے جاگری!

(بقیہ "نامراد")

بھکاری بچوں کے درمیان کوئی سکہ ڈالدیا تھا، جسے پالینے کی جدوجہد میں وہ ایک دوسرے سے دست و گریباں تھے۔

کلوا کی نگاہوں میں اُس پیدائشی یا کسی حادثہ کی بناء پر معذور و اپاہج بچے کی حسرت نصیب صورت پھر گئی، جو اپنے تندرست و توانا ساتھیوں سے الگ بڑ کے نیچے بےحس و حرکت، پڑا ہوا دور سے چمکیلے سکوں کو للچائی ہوئی مایوس نگاہوں سے تکا کرتا تھا۔

ناہید عالم

کھڑکی

ڈرائنگ روم کا پردہ سرکاتے ہی اُس کی نظر آنے والوں پر پڑی اور چائے کی ٹرے اُس کے ہاتھوں میں کپکپانے لگی ایک دم اُسے محسوس ہوا گویا کئی آنکھیں اُس پر جم کر رہ گئی ہیں۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ ٹرے وہیں پھینک کر بھاگ نکلے۔ اس کا جسم ان تیز تیز تنقیدی نظروں کے وار سہتے سہتے بالکل چھلنی ہو چکا تھا اور وہ اکثر تنہائیوں میں اس حد تک درد محسوس کرتی کہ اُسے خودکشی پر غور کرنا پڑتا، مگر غور کرنے کے بعد اُس پر عمل کرنے سے پہلے کوئی نہ کوئی ایسی بات ہو جاتی کہ وہ چڑ کر زندہ رہنے پر آمادہ ہو جاتی۔

"اچھا ہوتا کہ تو مر جاتی کمبخت" ماں جھلا جھلا کر اُس پر غصہ اتارتی۔

"لیکن ماں ——— " اس کا جی چاہتا کہ وہ چلا کر کہدے " میں بدصورت ہوں تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ قصور تو تمہارا ہی ہے کہ تم اور ابا دونوں ہی تو بدصورت ہو۔ تم اگر کسی خوبصورت مرد سے شادی کر لیتیں تو یقیناً ہمارے بچے تم سے اچھے ہوتے اور بہت سے لوگ جو مجھ سے اس لئے شادی نہیں کرتے کہ مجھے جہیز کافی مقدار میں نہیں ملیگا تو اس میں بھی میرا کوئی قصور نہیں۔ کیوں نہیں ابا زیادہ سے زیادہ روپیہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے؟ لوگ لڑکی کو کب دیکھتے ہیں اُس کی دولت کو دیکھتے ہیں اور یہ صورت شکل کا تو بہانہ ہے ورنہ تم خود سوچو کہ تم میں ایسی کیا کشش تھی کہ ابا نے تم سے شادی کر لی۔ یہی ناکہ تمہارے باپ نے تمہیں بیدریغ دیا۔ مگر میرا باپ ——— کاش! وہ بھی رشوت لیتا ہوتا"

معاً اُسے خیال آیا کہ اگر وہ کچھ دیر اور یوں ہی بیوقوفوں کی طرح دروازے میں کھڑی رہی تو اسے اس کی بہت سخت سزا برداشت کرنا پڑیگی۔ اس خیال کے آتے ہی وہ کانپ گئی اور قدم ڈالتی ہوئی، صوفے کے نزدیک رکھی ہوئی نیچی سی میز کی طرف بڑھنے لگی ماں شعلہ بار نظروں سے اُسے گھور رہی تھی اور آنے والی ایک سانولی سی لڑکی صوفے کے بازو پر جھکی۔ زیر لب مسکراہٹ کو چھپانے کے لئے اپنے لمبے لمبے یاقوتی ناخنوں سے کھیل رہی تھی۔

...... وہ چائے کی پیالی بیکر خاموشی سے ایک کرسی پر ٹک گئی، اس کا تمام جسم، ہلکے ہلکے ٹھنڈے پسینے سے بھیگ گیا تھا، اور جب پنکھے کی فرّاٹے بھرتی ہوئی ہوا، اُس ٹھنڈے پسینے کو خود میں جذب کر لینے کے لئے اُس کے جسم سے لپٹ گئی تو اُسے ایسا محسوس ہوا گویا وہ برف کی سلوں تلے دبتی جا رہی ہو، وہ کپکپا اٹھی اور اپنی اس غیر مہذبانہ حرکت کو چھپانے کے لئے سر سے ڈھلکتے ہوئے آنچل کو درست کرنے لگی۔

"کمبخت کسی کے سامنے بیٹھنے کی بھی تو تمیز نہیں تجھے" اُسے یاد آیا کہ ایک بار جب اس طرح ایکسائز انسپکٹر کی بہن اُسے دیکھنے آئی تھیں تو اُس روز اُسے ہلکا ہلکا بخار اور سر میں سخت درد تھا، وہ اُن کے سامنے خاموش بیٹھی اپنے درد کو دبانے کی کوشش میں بار بار پہلو بدل رہی تھی، اُس کا چہرہ اُداس تھا ——— مضمحل، مگر وہ کیا کرتی، دوسروں کا بولنا ہی اُس کے لئے عذاب ہو رہا تھا، کجا خود چہکنا۔ لیکن ماں کو اس سے کیا غرض، اسے تو اس کی شادی کرنا تھی چاہے وہ کسی طرح بھی ہو، ذلت سے، ہتک سے ——— ہنہ، اس سے تو بہتر ہے کہ شادی ہو ہی نہیں، کنواری بیٹھی بیٹھی وہ کوئی سوکھ تو نہ جائیگی، لیکن زیادہ غضب تو اُس روز ہوا، جب انسپکٹر کی بھتیجیوں نے جا کر کہا کہ " خدا کی قسم بھائی جان آپکے تو

پیر برابر بھی نہیں اور ویسے بھی ٹی۔بی کی مریض معلوم ہوتی ہے۔ ارے ——— میں کہتی ہوں، تمام وقت مجھے ایسا محسوس ہوتا رہا، گویا اب جان نکلی اور اب ———"

اور جیسے اُن کے گھر میں کوئی بم پھٹ گیا ہو "میرے اللہ، اس بدنصیب کو جانے کیا روگ لگ گیا ہے کہ ہر وقت مُنہ سُجائے پڑی رہتی ہے۔ آدمی کسی کے سامنے تو ہنس بول لے، اب دلہن بھی تو ہے ———"

دلہن! اور اُس کے تن بدن میں آگ لگ گئی، دلہن! کاش یہ اُس کے گھر نہ آئی ہوتی، یہ ذلیل عورت! اور کسی دکھ بھری یاد سے اُس کی آنکھیں بھیگ گئیں ———،

چار برس پہلے، جب وہ انیس برس کی ایک خاصی نکھری ہوئی رسیلی لڑکی تھی تو اس کے مکان کی اوپر کی منزل میں کالج کے چھ لڑکے رہا کرتے تھے، کتنے شریف تھے وہ لڑکے، باوجود اس کے کہ ان کے کمروں کی کھڑکیاں، اُس کے صحن میں کھلتی تھیں۔ انھیں کبھی کھڑکی میں کھڑا نہیں پایا۔ صبح کو دس بجے تک اُن کے گھر میں بالکل سناٹا رہتا اور اس کے بعد گیارہ تک ایک ہنگامہ ——— !نلکوں کے ایک ساتھ کُھلجانے کی دلچسپ آوازیں، فلمی گانوں کا سیلاب، چینی کے برتنوں کی جھنکاریں، کسی کے بگڑے ہوئے اسٹو کی گھوں گھوں اور کسی کا قمیص میں بٹن نہ ہونے کی وجہ سے جھنجلا جُھنجلا کے پھرنا اور بگڑ بگڑ کر بڑبڑانا ——— یہ سب کچھ اتنا دلچسپ تھا کہ وہ بھابی کی معنی خیز نظروں اور رس بھری باتوں کے باوجود گیارہ بجے تک بستر پر پڑی اس کا مزہ لیا کرتی۔

اور پھر ———، ایک دن اس کی تمام قمیصوں کے بٹن غائب ہو گئے، پتلونوں کے ہک نکل گئے، اور اُس کے سب سوٹوں پر بیشمار شکنیں پڑ گئیں، اُس نے غصّے میں آکر اپنے نوکر کو پیٹ دیا "پاجی کہیں کا مہینے بھر سے کہہ رہا ہوں کہ سب چیزیں درزی کے پاس لیجا مگر سنتا ہی نہیں۔ آج کالج سے واپسی پر تمام چیزیں ٹھیک نہ ملیں تو کھال اُدھیڑ کر رکھدوں گا ——— اُلّو!"

اور پھر زینے میں سیٹی کی آواز مدھم ہوتے ہوتے بالکل معدوم ہو گئی۔

دوپہر کو سر درد کا بہانہ کر کے اُس نے اپنا کمرہ بند کر لیا، اور پچھلا دروازہ کھولکر اوپر والوں کے نوکر کو بلا بھیجا،

"تمھارے بابو جی، آج تم پر خفا کیوں ہو رہے تھے؟" اُس نے بظاہر کتاب پڑھتے ہوئے لاپرواہی سے پوچھا۔

"جی، بات یہ ہوئی کہ ان کے سب سوٹ استری کے لائق ہو رہے ہیں اور قمیصوں میں بٹن کمبخت دھوبن رہنے نہیں دیتی، مجھے تمام دن اتنا کام رہتا ہے کہ درزی کے ہاں جانے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ بس، اسی بات پر خفا ہو رہے تھے"

"تو تم بہت کام کرتے ہو کیا؟ اس وقت کیا کر رہے تھے؟"

"صبح سے اب تک تو میں نے چاروں کمرے صاف کئے، کتابیں جمائیں، بوٹ پالش کئے، اب موزے دھو رہا تھا کہ آپ نے بلا لیا، بڑی مشکل میں جان ہے۔ ابھی تو مجھے شہر جا کر ارشد میاں کی پھوپی کے ہاں سے چند چیزیں بھی لانا ہے۔ درزی کے پاس جانے کا وقت تو شاید آج بھی نہ ملے" اُس نے رحم طلب نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا،

بچارہ بچہ!

"یہ ارشد میاں کون ہیں؟"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ کون ہیں، ویسے بچارے ہیں بڑے اچھے، ایک رفیق صاحب ہیں، بس ہر وقت پیٹنے کو تیار جب دیکھو ڈانٹ رہے ہیں چاہے کسی کا، کام کرتے کرتے، کچومر نکل جائے، مگر ان کے فیشن میں کمی نہیں آتی، پر ایک بات ہے بی بی، سوٹ ووٹ پہن کے لگتے بڑے خوبصورت ہیں۔ ایک دفعہ سینما میں بھی میں نے ایک ایسے ہی بابو کو دیکھا تھا، جو ایک گوری گوری لڑکی سے ملنے اُس کے باغ میں جایا کرتے تھے۔ ایک دن کیا ہوا کہ ———"

" اور تمہارے بابو سوٹ ووٹ پہن کے کہاں جاتے ہیں ؟" لڑکا اُسے فلم کی پوری کہانی سنانے پر آمادہ تھا، مگر اس نے بیچ ہی میں بات کاٹ دی۔

" اب میں کس کی بات بتاؤں ؟ میں تو چھیوں بابوؤں کا نوکر ہوں " اس نے اپنی بساط کے مطابق گویا مذاق کیا۔

" رفیق صاحب کی بات ——— "

" رفیق صاحب تو کہیں بھی نہیں جاتے بی بی۔ بہت ہوا تو بازار کے چکر لگائے، سینما چلے گئے۔ ہاں ارشد میاں، اور الطاف صاحب کے ساتھ میں نے کئی مرتبہ سیمیں دیکھی ہیں اور خدا جانے کیا عادت ہے ان الطاف صاحب کی، رفیق صاحب بہت منع کرتے ہیں، مگر وہ رات کو ایک آدھ گلاس دوائی کا پیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ توبہ، کتنی سڑی ہوئی اور بدبودار ہوتی ہے ان کی دوائی، میں تو کبھی نہ پیوں "

" تو کیا وہ کچھ بیمار ہیں ؟ "

" ہاں جی بی۔ رات کو دوائی پینے کے بعد تو اُن کی طبیعت ایکدم بگڑ جاتی ہے اور وہ یونہی بکنے لگتے ہیں، بکنے کیا۔ رفیق صاحب تو بہت چڑتے ہیں۔ ایک دن الطاف صاحب کہنے لگے کہ "تم بھی پیو"۔

مگر وہ بولے کہ " دیکھو بھائی، یہیں سے ہمارے راستے الگ ہیں، ورنہ تم کہو تو تمہارے لئے جان تک دینے کو تیار ہوں "

" مجھے تمہاری جان کی ضرورت نہیں " وہ بہت زور سے ہنس پڑے " اگر تم کچھ دینا ہی چاہتے ہو تو ایک بوتل ——— ہا، ایک بوتل !"

خدا جانے انھیں دوائی پینے میں کیا مزہ آتا ہے ؟ "

" دوائی نہیں ہوگی وہ پگلے، الطاف صاحب شراب پیتے ہونگے "

" شراب ؟" وہ چونک پڑا " الطاف صاحب شراب پیتے ہیں، تب تو وہ بڑے بُرے آدمی ہیں، جب میں چھوٹا سا تھا اور گاؤں میں، اپنے باپ کے پاس رہا کرتا تھا تو ہمارا ایک پڑوسی شراب پیتا تھا، ایک دن میں، اسکول سے واپس آرہا تھا تو میں نے اُسے اُلٹے منھ نالی میں گرے دیکھا۔ اسکول میں سب ماسٹر کہتے تھے کہ شراب پینا گناہ ہے، یہ بہت بُری چیز ہے اور جو ماسٹر صاحب ہمیں پانچویں میں پڑھاتے تھے وہ تو شراب کا نام تک لینا بھی گناہ سمجھتے تھے، ہم تو خیر بی بی پانچ جماعتیں ہی پڑھے ہیں۔ مگر الطاف صاحب تو بانہ جماعت میں پڑھتے ہیں۔ تب بھی شراب پیتے بُرا نہیں لگتا انھیں ؟"

" ٹُن ——— ! "

ساتھ ہی کمرے میں کلاک نے ایک بجایا تو وہ چونک پڑا۔ ارے — " اچھا بی بی اب میں جاتا ہوں۔ بہت کام پڑا ہے ابھی تو مجھے "

" ——— ٹھہرو، ایک بات تو سنو، دیکھو تم رفیق صاحب کے سب سوٹ اور قمیص مجھے لا دو۔ میں اُن کے کالج سے آنے سے پہلے سب ٹھیک کر دونگی۔ لو جاؤ "

" سچ ؟ ابھی لیجئے، ارے ——— " اور وہ خوشی کے مارے لڑکھڑاتا ہوا بھاگا۔

اُس کے کپڑوں پر استری کرتے ہوئے وہ کچھ عجیب سا سرور محسوس کرنے لگی، لیونڈر کی بھینی بھینی خوشبوئیں جیسے اُسکے احساسات پہ چھاتے چھاتے اس کی روح میں مدغم ہونے لگیں، اس نے سیکڑوں بار اپنے بھائی کے معطر سوٹوں پر بھی استری کی تھی، مگر جو لطف اُسے آج آرہا تھا، پہلے کبھی نہ آیا تھا۔ ایک، دو ——— اور تیسرے سوٹ پر استری کرتے ہوئے

،، ٹھٹک گئی، اُسے جیسے دھکا سا لگا۔ سینٹ میں بسے ہوئے لیڈیز رومال ——— ، وہ مایوسی سے باقی جیبیں خالی کرنے لگی۔ پنسلیں کچھ سینما کے ٹکٹ، اور ایک چھوٹے سے نیلے لفافہ میں ملفوف خط، بہت بے نیازی سے اس نے اُسے کھول ڈالا۔ "بھائی جان چلتے وقت جو آپ میرا رومالوں کا ڈبہ اُڑا لائے تھے، خدا کے لئے اُسے استعمال کیجیگا لوگ تو یونہی بات لے اُڑتے ہیں۔ اور پھر ارشد بھائی اور اُن کے رشتہ دار، کیا فائدہ کہ کوئی غلط فہمی میں مبتلا ہو! حروف اس کی آنکھوں کے نیچے تیلیوں کی طرح ناچنے لگے۔ اُس کی بہن! اُسے غیر ارادی طور پر اُس سے عقیدت ہوگئی اور ایک خیال۔ کسی تیز رفتار پرندے کی طرح اُس کے دماغ میں آیا اور گذر گیا۔ جیسے دھیرے سے کسی نے اُس کے کان میں پھونکدیا ہو، "بھابی!" اور خود ہی خود لجا کر رہ گئی۔ اگلے روز صبح کو وہ ہنڈیا چڑھا کر آرہی تھی کہ اُس نے ننّے کو بچتے بچاتے، باورچی خانہ کی طرف بڑھتے دیکھا۔ "کیا ہے رے ننّے؟" صحن میں دھوپ سینکتی ہوئی بھابی نے پوچھا۔

"کچھ نہیں جی۔ ذرا بی بی سے کالی مرچیں لینا ہیں، ہمارے گھر ختم ہوگئی ہیں۔"

باورچیخانہ میں پہنچکر، ننّے نے چپکے سے ایک لفافہ نکال کر اُسے دیدیا اور کالی مرچیں لیکر کوئی سستا سا فلمی گیت گنگناتا چلا گیا۔

"چھنّن۔ چھنّن، چھنن، چولہے پہ رکھی ہوئی ہنڈیا میں پانی ختم ہوگیا تھا اور آگ کی لپٹیں بڑھ رہی تھیں۔ اُس نے جلدی میں، پانی کی بھری گڑوی ہنڈیا میں اونڈیل دی۔ اور ایک عجیب سی کیفیت لئے، اپنے کمرے میں بھاگ آئی۔

دھڑکتے ہوئے دل سے، اُس نے خط کھولا۔ "میں آپکی اس تکلیف فرمائی کا بیحد ممنون ہوں۔ سچ عرض کرتا ہوں کہ اس اجنبی شہر میں، آپکی اس ہمدردی نے میرے دل سے اجنبیّت کا احساس یکلخت کم کردیا ہے اُس کا جی چاہا کہ وہ اس خط کا جواب دے، مگر لکھے کیا؟ عجیب احمقانہ سی بات ہوگی۔ اگر وہ لکھدے کہ "جی نہیں۔ اس میں تکلیف کی کیا بات ہے بھلا۔ مجھے تو خوشی ہوئی کہ ———" لاحول ولا۔

وہ سمجھے گا کہ بیحد جذباتی لڑکی ہے یہ۔ اور بھئی میں تیرا کیا لگتا ہوں جو تجھے میرا کام کرنے میں خوشی محسوس ہوتی ہے۔ . . . ———

اُس روز گوشت کا حلوہ بن جانے پر اُسے خوب ڈانٹ پڑی "دو دن کو نوکر نہ ہو تو مصیبت پڑجاتی ہے دور بنّو، کوئی کلرک تک تو تمہیں قبولتا نہیں۔ دماغ بڑھا رکھے ہیں، گویا کوئی ڈپٹی ہی تو ل جائیگا" اچھا ہی ہوا تھا جو کلرک نے اُسے نہیں قبولا تھا۔ وہ سوچنے لگی .... اور خدا جانے یہ مرد اپنی شکلیں کیوں نہیں دیکھتے، بس بیوی خوبصورت ہو۔ اور جو خوبصورت بیویوں کو حبشی میاں ملتے ہیں تو وہ ہائے واویلا کیوں نہیں کرتیں؟ یہی کہاں کے نواب ہیں کہ ——— اُنہہ، خیر بھئی ایک وقت کو یہ بھی مان لیا کہ خوبصورت مرد اور خوبصورت بیوی کی تلاش کرتے تو کچھ بُرا نہیں کرتے، مگر یہ لنگور کی شکل کے مرد ——— بھئی تمہیں تو جو بھی مل جائے اُسی کو غنیمت سمجھو، مگر نہیں، لڑکیوں کے عیب ڈھونڈھ نکالتے ہوئے سب سے آگے یہی ہوں گے۔ وہ مردوں کو بھی خراب کرتے ہیں، جس روز سے، اس کلرک نے اُسے بدصورت کہکر ٹھکرایا تھا، وہ خود کو واقعی ایسا سمجھنے لگی۔ مگر اب ——؟ اب کیا؟ یکایک اُسے اپنی غلط فہمی کا احساس ہوا۔ رفیق نے اُسے دیکھا ہی کب ہے؟ ایک خط لکھدینے کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ ———، لیکن شام

کھڑکی

ہی کو وہ کھڑکی میں کھڑا، بظاہر پنسل بناتا ہوا کنکھیوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

اب ہر وقت دونوں کھڑکیاں کھلی رہنے لگیں، اس کے کمرے کی کھڑکی بالکل رفیق کی کھڑکی کے مقابل تھی، اس لئے خواہ وہ کمرے کے اندر ہوتی یا باہر وہ کھڑکی میں کھڑا اُسے تکا کرتا، شروع شروع میں تو وہ نفتے کی خوشامدوں میں لگے رہتے لیکن رفتہ رفتہ ان میں جرأت پیدا ہوگئی اور اب اکثر راتوں کو رفیق کھڑکی میں سے پھینک کر اُسے خط پہنچانے لگا، لیکن ایک رات ـــــ اس سے پہلے کہ وہ کام ختم کر کے صحن میں نکلے رفیق خط پھینک چکا تھا۔ اور نہ جانے کیسے وہ ماں تک پہنچ گیا۔

اور اس کے بعد ـــــ طعنے کوسنے، مار ڈالنے کی دھمکیاں، الزام ـــــ، اس کا جی چاہا کہ وہ کہیں ڈوب مرے لیکن جب اُس کے بھائی کی بیوی نے اپنی سہیلی کو تمام قصہ سناتے ہوئے کہا کہ "شریف زادیوں کو یہ لچھن، توبہ، توبہ سچ کہتی ہوں، غیرت والی ہو تو ڈوب مرے کہیں جا کے" تو ضد میں آکر اس نے سوچا کہ وہ بس ڈوب ہی نہیں مرے گی۔ ہنہ خود نہ ڈوب موں، جب شادی سے پہلے قاسم کو اُس کے ہاتھ خط بھجوایا کرتی تھیں، اور ایک دن تو قاسی بھیا نے اُن کے ہونٹ تک ـــــ، اور اب کیسی پاکباز بنی بیٹھی ہیں۔

اس کے دل میں بھابی کے خلاف نفرت اور غصے کے جذبات اُٹھ رہے تھے، پہلے وہ ان ہی بھابی سے کتنی محبت کیا کرتی تھی۔ اُسے خیال آیا، مگر بھابی نے کبھی اُسے اپنا نہ سمجھا، اور اُس روز وہ کتنی خوش تھی، جب رفیق کی ماں اُس کے یہاں پیام لیکر اُسے دیکھنے آئی تھی اور تقریباً سب کچھ طے بھی ہو گیا تھا۔ مگر بھابی کو یہ بھی گوارا نہ ہوا۔

"یہ سویٹر آپ نے خود بنا ہے؟ بڑا خوبصورت ہے" اُس نے اُس کے سویٹر کی تعریف کی، بھابی جھٹ بول اُٹھیں۔

"جی ہاں، ویسے تو یہ سویٹر کافی اچھے بنا لیتی ہیں، مگر یہ میں نے بنا ہے"

اور اس کے بعد گھوم پھر کے جب اُس نے اُس کے باپ کی آمدنی کے متعلق پوچھ تو پیشتر اس کے وہ کچھ کہتیں، بھابی بول اُٹھیں "تنخواہ تو ڈیڑھ سو ہے، مگر الاؤنس وغیرہ ملا کے ڈھائی پونے تین سو کے قریب ہو جاتے ہیں، مگر آجکل اس میں بھی کیا گذارا ہوتا ہے اور پھر بچوں والوں کی تو بہت مشکل ہے، دو جوڑ کپڑے بنانا بھی قیامت ہے"

حالانکہ اُس کے باپ کی تنخواہ چار سو کے قریب تھی، یہ سچ ہے کہ چار سو میں سات آٹھ آدمیوں کا گذر مشکل ہے۔ مگر ایسی باتیں کہیں ایسے لوگوں کے سامنے کہی جاتی ہیں؟ ساس نے برا بھلا کہا تو اور بگڑ کھڑی ہوئیں "تو بھلا کبھی بری بات میں تنخواہ آئی ہے، جو مجھے معلوم ہو کہ کیا ہے، اور تین سو ہی کیا کم ہیں؟ وہ کون ایسا گورنر کا بیٹا ہے ـــــ، مجھے کیا، رہی ہے نا، چاہے کتنا ہی کما لے"

"جی ہاں، وہاں پہنچکر آپ کو خط لکھونگی" اُس نے جاتے جاتے کہا تھا "[illegible]"

تین مہینے گذر گئے، لیکن اُس کا کوئی خط نہ آیا، بھابی کی مسکراہٹ میں ہر دن معنی اور بڑھ رہی تھی ـــــ ماں کھسیا کھسیا سے کچھ کہتی تھی اور بھیا کی خاموشی سب سے زیادہ معنی خیز تھی، وہ خود کو بالکل بے سہارا محسوس کرنے لگی ـــــ اسکے دل میں بیتے ہر گھڑی سائیں سائیں کرتی ہوائیں فراٹے بھرا کرتیں ـــــ زندگی اس کے لئے بالکل سپاٹ ہو گئی تھی۔ لق و دق صحرا ہی ہے، وہ شدید احساس تنہائی سے دیوانوں کی طرح چکر لگاتی، لیکن کہیں بھی پیاس بجھانے کا سامان نہ تھا۔ اور وہ اس حد تک پیاسی تھی کہ اس کی آب حیات کی اسے تلاش ـــــ مرنے کی خواہش بھی مرگئی تھی ـــــ بس پانی ـــــ کھاری، گدلا ـــــ بہتا ہوا، کیسا ہی ہو، مگر پانی ـــــ لیکن پانی کو تو وہ ترس گئی، سارا ریگستان تھا بھی تو پانی کا دھوکہ اور ان سرابوں کے چکر میں پھنسکر وہ اور بھی زیادہ پیاسی ہوگئی تھی ـــــ

ساتھ کے کمرے میں کسی نے کوئی چینی کا برتن زمین پر دے مارا تھا —— وہ چونک پڑی اُس کی پیالی میں چائے ختم ہو چکی تھی، وہ خالی پیالی میز پر رکھنے لگی، تو آنے والی ایک عورت نے پوچھا " یہ میز پوش آپ نے بنایا ہے؟ "

"جی نہیں، میں نے ابتک کچھ نہیں کاڑھا، مجھے ایمبرائڈری سے سخت نفرت ہے"

اُس نے پہلے ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ آج بھابی کو شکست دیکر رہیگی۔ آنیوالی عورت اُن کی خالہ کی نند کی بھتیجی تھی!

"اور یہ کیک تو بہت لذیذ بنایا ہے آپ نے"

"میں نے؟ جی نہیں، امّی نے بنایا ہے، مجھے تو پکانا بالکل نہیں آتا۔ سب کام امّی ہی کرتی ہیں"

بھابی نے گھور کر اُسے دیکھا، مگر وہ نظر انداز کر گئی، کافی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔

"خیر اِس بحث کو چھوڑیئے، یہ بتایئے کہ آپکو کونسا افسانہ نگار پسند ہے؟" لڑکی نے پوچھا۔

"عصمت اور منٹو"

"ارے —— لیکن یہ لوگ تو سخت بدنام ہیں" "اس سے کیا؟ حقیقت سے تو نزدیک ہیں" "اپنا اپنا خیال ہے"

بھابی اپنی جگہ بیٹھی بار بار پہلو بدل رہی تھیں، "یہ برتن لیجاؤ نسرین، اور پان بنالاؤ" "جی اچھا!"

اور جب وہ دروازے سے باہر نکل رہی تھی تو اُس نے بھابی کو کہتے سنا "کمبخت نوکروں کا بھی آجکل کیسا قحط پڑا ہے چار مہینے سے ایک بھی نوکر نہیں ہے ہمارے ہاں، لیکن نسرین کا دم ہے کہ سارا کام خوش اسلوبی سے چل رہا ہے"

اس کا جی چاہا کہ وہ پلٹ کر کہدے "یہ سب جھوٹ ہے، گھر میں باورچی بھی موجود ہے اور لڑکا بھی —— یہ سب ڈھونگ تو آپکو دکھانے کے لئے رچا گیا ہے" —— لیکن وہ دروازے سے باہر نکل چکی تھی۔

ماں نے آتے ہی اُس کی چوٹی کھینچ لی "بدنصیب، وہ جا بھی چکیں اور تیرے پان نہ آئے، یہاں کھڑی آنکھیں لڑا رہی ہے بیسوا!"

پانوں کا خاصدان اس کے ہاتھ سے چھٹ کر زمین پر بکھر گیا، رفیق کھڑکی میں بیٹھا اُسے گہری گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"اور صاحبزادے، —— شریفوں کے یہی دستور ہوتے ہیں کیا؟ آپکو شرم ——"

وہ کتنی دیر تک سنتی رہی مگر وہ خاموشی سے وہیں بیٹھا سگریٹ پیتا رہا۔

ماں نے غصے سے، دل جلی ہوئی، اور بیدردی سے، اُسے گھسیٹ کر کمرے میں دھکا دیکر باہر سے دروازہ لگا آئی،

"مر کمبخت بدنصیب" وہ وہیں اوندھی پڑی پڑی نہ جانے کتنی دیر تک سُبک سُبک کر روتی رہی اور جب اُٹھی تو —— رفیق کی کھڑکی بند ہو چکی تھی اور پرلی طرف اُسے ہمیشہ کے لئے بند کر دینے کے لئے، پتریوں پر کیلیں ٹھوکنے اور ہتوڑہ چلنے کی آواز جیسے اُس کے کانوں کے پردے پھاڑے ڈال رہی تھی۔

اس نے جھپٹ کر اپنی کھڑکی بھی بند کر دی۔ اور پتریوں اور کیلوں کی تلاش میں الماری، درازیں اور ڈبے ٹٹولنے لگی —— !

قمر جمالی

لچک

کمرے میں قدم رکھتے ہی اُسے جانے کیا ہوگیا —— ایوننگ پیرس اور افغان اسنو کی ملی جلی خوشبو ناک کے سوراخوں سے داخل ہوکر اس کے پورے جسم میں اس طرح پھیل گئی جیسے وہ خود مجسم خوشبو ہو، مکمل نکہت، سراپا پھول، جس کے تخییل کی تابناک وسعتوں میں رنگ و بو کے ہزاروں جہان آباد ہوں ...... دفعتاً کانوں کے پردے پھڑپھڑانے لگے، کنپٹی کی رگیں پھڑکنے لگیں اور آنکھوں میں شرارے ناچنے لگے اور ایک نیم شعوری آرزو گونج بنکر اس کے دماغی خول میں مکھیوں کی طرح بھنبھنانے لگی، اس کی رگ رگ میں تشنج ہونے لگا، ایک ایسا بے بنیاد اجتناب کہ جسے وہ نہیں بلکہ اس کا لاشعور محسوس کر رہا تھا۔ چند لمحوں کے استعجابی سکوت کے بعد جلتے دھرتی کے پیٹ سے یا آسمان کی نیلی نیلی، اودی اودی وسعتوں سے ڈھکے ہوئے مکان کی چھت کو پھوڑکر ایک لامحدود جرأت اس کے دل میں اس طرح آگئی کہ وہ سب کچھ بھول گیا، —— وہ کیا ہے ——؟ کیوں ہے —— کون ہے —— اور کس کے پاس کھڑا ہے ——؟؟؟ ابھی ابھی سانسوں کے تموج کے سوا اس کے دماغ میں انگارے دہک رہے تھے شریانوں میں شعلے لپک رہے تھے۔

نسرین محویت کے عالم میں آئینے کے سامنے کھڑی اپنے لانبے سیاہ بالوں کا جوڑا گوندھ رہی تھی، اُف یہ بال، کالے کالے گھونگھریلے بال اور ان کا پیچ و خم، یہ کشش انگیز الجھاؤ، اس کی طبیعت چاہی ان میں الجھکر رہجائے —— مگر —— اس نے محسوس کیا نسرین کی رنگ، رنگ میں جواں سال انگڑائیاں ٹوٹ رہی ہیں، ہونٹوں کے سنگم پر مسکراہٹوں کی چنچل پریاں ناچ رہی ہیں، پیشانی پر قوس و قزاح کے رنگ جھلک رہے ہیں، کہکشاں کی لڑیاں جھوم رہی ہیں، حسن مسکرا رہا ہے، محبت گا رہی ہے وہی پرانا گیت جو پرانا ہونے کے باوجود نیا تھا، ہر بار نیا، ہر آن نیا، جس کی دوامی دلکشی، ناقابل تسخیر آسودگی، ابدی نشہ اور لافانی کیف ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ جوان رہیگا، جوان! جوانی، دیوانی، نشہ، کیف، مستی، بے خودی......

اس کے بکھرے بکھرے، ٹوٹے، ٹوٹے خوابوں کا منتشر سلسلہ اس کے شعور کی گہرائیوں سے اُبھرا اور ابھر کر دل کی کائنات پر ابخرات کی طرح پھیل گیا، دل میں امنگوں کے لامتناہی سلسلے میں ایک لہر سی اُٹھی، گونج سی پیدا ہوئی اور عمل نے یقین کے باریک باریک شہد آگیں لبوں کو چوم لیا۔

نسرین کے نرم نرم گداز بازوؤں میں اس کی پتھریلی اُنگلیاں پیوست ہوگئیں، اوہ ———— نسرین فرطِ لذت سے ایک ناتمام سسکی بھری —— پھر ایک ادھوری گردش کے بعد، اس کے لرزتے ہوئے گرم گرم انگاروں کی طرح سرخ ہونٹ نسرین کے باریک باریک گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح نازک، برف کی قاشوں کے مانند خنک، اور شہد کی طرح شیریں لبوں سے پیوست ہوگئے، دونوں کی آنکھیں بند تھیں، سانسوں کی باگیں تنی ہوئی تھیں۔ دونوں کھڑے ہوئے تھے قد آدم آئینہ کے سامنے ...... دنیا و مافیہا سے بے نیاز، کون و مکاں کی گرفت سے دور اخلاقی احتساب کی دسترس سے پرے ——

جہاں نیلے نیلے پیلے پیلے، سرخ سرخ، اودے اودے ریشمی پیراہن لہرا رہے تھے، بلبلیں گا رہی تھیں، کوئلیں کوک رہی تھیں کلیاں چٹک رہی تھیں، پھول کھل رہے تھے اور خوشبوؤں کی چنچل پریاں رقصاں تھیں اور تاحد نگاہ نور ہی نور، رنگ ہی رنگ، تارے ہی تارے چھٹکے ہوئے تھے، ننھے منے، نیلے پیلے، جھلمل جھلمل کرتے ہوئے شریر تارے

...... پھر ایک دم تنفس کی باگیں ٹوٹ گئیں، دونوں خالی الذہن کھڑے ایک دوسرے کو خمار آلود نظروں سے گھورنے لگے، —— دفعتاً جھکی جھکی پلکوں کے سائبانوں میں دو ننھے ننھے شرارے کانپے ..... اور بجلی کی طرح تڑپ کر نسرین نے اس کے جذبات کی شدت سے دہکتے ہوئے رخسار پر ایک طمانچہ جما دیا ....

مانا کہ نسرین اس کی بہن تھی، مگر خالہ زاد —— اس نے ایسا کیوں کیا —— ؟ کیوں —— ؟؟ اس کی جھکی جھکی آنکھوں، ہر پل جھپکتی ہوئی پلکوں اور چہرے کے ہر آن بدلتے ہوئے رنگوں نے اس سے کتنی مرتبہ کہا تھا —— جمیل، میں تم کو چاہتی ہوں، دل سے، روح کی گہرائیوں سے، مجھے تمہاری ضرورت ہے، کیا ہوا، جو ہم سماجی نگاہوں میں بہن بھائی ہیں، مگر سگے تو نہیں اور یہ رشتوں کا جال تو انسان کو ذہنی آزادی سے معذور کرنے کے لئے بچھایا گیا ہے۔ اس سے کوئی روحانی مفاد نہیں، میرا یہ گریز، یہ اجتناب دعوت ہے، تمہارے التفات کو حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، تمہارے شوق کو بھڑکانے کا قصد ہے، کیا ہم دونوں محبت نہیں کر سکتے ؟؟ لیکن وہ دیدہ و دانستہ گریز کرتا رہا۔ اخلاق کے احتسابی اصولوں، سماج کی قہر آلود نظروں اور اپنے شعور کی دفاعی قوتوں کے خوف سے .....

نسرین تکیہ میں منہ چھپائے سسکیاں بھر رہی تھی، اس کی پیٹھ پر سانپ کی کونڈلی کی طرح پڑے ہوئے بال ہولے ہولے پھسل رہے تھے، بکھر رہے تھے، اس کے خیالوں کی طرح، اس کے نغموں کی طرح، اس کے شعروں کی طرح ....

کسی نے یہ بھی نہ پوچھا کیسی طبیعت ہے جمیل ...... وہ دن بھر خاموش پڑا سوچتا رہا، پرانی باتیں، ادھورے سپنے اڑے ہوئے رنگ، بھرے ہوئے نشان، اس کے دل و دماغ اور ذہن میں ایک طرح کا شدید ترین انتشار پھیلا ہوا تھا۔ اس کے دل میں رہ رہ کر ہوک سی اٹھتی، آنکھوں میں چنگاریاں سی بھڑکنے لگتیں، گالوں پر خون جھلک آتا تھا اور اس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر اپنا بایاں رخسار سہلانے لگتا۔

آپ ہی آپ اس کے سینہ کی گہرائیوں میں سے ایک غیر جانبدار قوت ابھرتی اور پوچھتی —— ہاں، واقعی آخر کونسی قوت تھی جس نے اس کو اس قدر بیخود کر دیا، قطعی اندھا۔ —— وہ کیوں بھول گیا کہ نسرین اس کی بہن ہے اور بہن کی محبت، روحانی نہیں، جذباتی۔ رومانی۔ ایک بہن سے جنسی مراجعت کسی قانون، کسی قاعدے، کسی ضابطہ، کسی اصول کی رو سے جائز نہیں، نہ اخلاق کی رو سے، نہ مذہب، نہ سوسائٹی، نہ سماج، نہ برادری، تو پھر اس نے ایسا کیوں کیا —— ؟

اس کا ذہن دھیرے دھیرے اڑتا، پروں کو پھڑپھڑاتا، عقابی نگاہوں سے راستے کی ہر ایک چیز کو دیکھتا ہوا ماضی کے گھنے جنگلوں میں پہنچ کر رکجاتا۔ پھر کھو جاتا ......

"اوہو —— آئیے، آئیے، حضرت —— مزاج مبارک —— ؟" ہر طرف سے اس کا شاندار خیر مقدم ہوتا۔

"اچھا —— تو آپ ہیں، خوب ..... اور سنائیے ....؟"

"اور دیکھئے —— "کبھی کبھی تعارف کی بھی نوبت آجاتی —— "آپ کا نام ہے .... مسٹر جمیل اختر، شیدا —— یہ شیدا دراصل آپ کا امتیازی نام ہے، ورنہ آپکو شاعری وائری سے کوئی لگاؤ نہیں، آپ اگر شیدائی ہیں تو .....

کہہ دوں بھائی جان —— شریر احمریں کے گالوں میں گڈھے پڑ جاتے، پلکیں جھپکنے لگتیں، اور نسرین جانے کیوں آپ ہی آپ گڑی مڑی ہو کر گٹھری سی بنجاتی ....

"اوہو نسرین —— " رشید چلاتا —— "کیا بیہودگی ہے یہ، بڈھی ہو گئی مگر .... "

معاً نسرین کا رنگ قرمزی ہو جاتا، جیسے چوری کرتے پکڑی گئی ہو، گالوں سے شفق کی لالی پھوٹنے لگتی۔ آنکھوں میں آئینے لہرانے لگتے، پلکیں جلدی جلدی جھپکتیں اور نوکیلوں کے پیچھے سنسناتے ہوئے خون کی روانی کے زور پر نگاہیں

اوپر اٹھیں اور امی کے چہرے کا جائزہ لیتی ہوئی پاندان کی چابی، خاصدان کی چونچ یا سامنے دیوار پر آویزاں کسی بھی تصویر پر اٹک کر رہ جاتیں، ہاتھ تیزی سے ڈوپٹہ کو مروڑنے لگتے، موگرا، موتیا، یا چنبیلی کی نوشگفتہ کلیاں نہایت بے دردی سے مسلی جانے لگتیں، یا پانوں کے ڈنٹھل سے پتے ٹوٹنے لگتے گویا گھر میں پان کھلانے والوں کی فوج ہی تو گھس آئی ہو...

"بھئی --" شمیرا احمرین جھکتی -" خدا کی قسم آپا جان، بس آپ سے بھی حد ہے، اکیلے میں چاہے دل ہی دل میں..... بس عجیب ہیں آپ بھی...."

"عجیب ہی نہیں بلکہ عجائب خانہ میں رکھے جانے کے قابل ——— آج سے سو سال پہلے کی ہندوستانی عورت کا ماڈل .... اُوئی، اُوئی، چھوئی ...."

"مگر یہ تو بس تمہیں بھدی کے سامنے ہی ایسی ہو جاتی ہیں، ورنہ دن رات اچھلتی کودتی پھرتی ہیں ہنگوں کی طرح ——"

——— وہ اور سکڑ جاتی لیکن اس سکڑاؤ میں ایک عجیب سی کیفیت ہوتی، ایک امنگ پرور لچک، ایک طرح کا طربناک گھماؤ اور ایک ایسا دلفریب، خوبصورت اور رنگین مد و جزر ہوتا جس کو وہ نہیں بلکہ اس کا لاشعور محسوس کرتا، مگر چند لمحوں کے خیر مقدم کے بعد لاشعور اس عجیب سے ہیجان پرور مشاہدے کو محسوسات کے پوشیدہ تہہ خانوں میں مقفل کر دیتا لیکن یہ مجرم احساس کبھی کبھی تنہائیوں میں چور دروازوں سے نکل کر اس کے ذہنی توازن میں خلل ڈال دیتا، اس کا ذہن دھرتی کے سینے پر بسنے والی انسانی سوسائٹی کے زہریلے امتیازوں، سماجی احتساب کے ہلاکت آفریں اصولوں اور سرمایہ کی غیر مساوی تقسیم کے اثرات اور انکی بیدردی کے احساس مفلسی، بھوک اور پیاس کی شدت سے تڑپ تڑپ کر جان دینے والوں کی بے بسی و بیکسی کے غم اور انسانیت کی فطری آزادی کے حصول میں مرنے والوں کے جذبۂ انسانیت تیاگ اور قربانی کی سچائی، عداوت اور اس کے بعد انکی بے اثری کے پُرالم تاثر سے بھاگ کر، رنگ اور روپ، جوانی اور نکھار خوبصورتی اور آرٹ، حسن و عشق، ولولوں اور آرزوؤں کی سرسبز اور شاداب وادیوں میں نغمہ سرا بلبلوں اور خوش الحان پرندوں کے چہچہوں اور ماحول کے رسیلے سنگیت میں ڈوب جاتا، کھو جاتا اور محسوس کرتا کہ زندگی کا تمام کیف، تمام رس، تمام لذت ان ہی نغموں کی گونج میں ہے، ان ہی رسیلے سنگیتوں کی لے میں ہے اور ان ہی سرسبز و شاداب وادیوں میں کہیں کسی سربلند پہاڑی کی چوٹی پر چمکیلے مہتاب کی کرنوں کی سیڑھیوں پر رقصاں دوشیزہ حیات کے ان چھوٹے گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح خوبصورت اور شہتوت کی طرح رسیلے ہونٹوں کے ایک طویل بوسے کا تمام کیف، تمام لذت تمام خمار، اس کے انگ انگ میں، جوڑ جوڑ میں، دل و دماغ اور ذہن کے گوشے گوشے میں مصری کی ڈلیوں کی طرح گھل رہا ہے اور یہی کیف، یہی لذت اصلی اور ابدی حیات ہے - زندگی کا دوسرا نام - تنفس کا محور، جینے کا مقصد

..... لیکن جب یہ احساس سنجیدگی کی صورت اختیار کرنے لگتا اور اس میں وسعت اور سربلندی اور وزن پیدا ہونے لگتا تو یکایک وہ اس جذباتی تلاطم کی جوازی صداقتوں کے اظہار اور اس کے ذہنی رد عمل کے خوف سے گھبرا کر اپنے اردگرد ایک گھبرائی ہوئی نگاہ ڈالتا، تا حد نگاہ اسے نقرئی کرنوں کی مرتعش دھندلاہٹوں کا ایک تسلسل پھیلا ہوا دکھائی دیتا، پھر یکایک مغربی وسعتوں سے طلائی شعاعوں کا غبار پھوٹ پڑتا، دو متضاد رنگوں کے ٹکراؤ سے ایک نیا رنگ، ایک نئی روح ایک نیا ماحول بن جاتا۔ ڈوبا، ڈوبا - کھویا، کھویا - اداس اور بوجھل پھر ایک لایعنی دباؤ، ایک ناقابل برداشت بوجھ اس کو اپنے کشادہ آغوش میں لیکر بھینچ لیتا - نقرئی کرنیں، طلائی کرنوں میں جذب ہو کر دھندلکوں میں تحلیل ہو جاتیں اور دھندلاہٹوں میں گہرائی وسعت اور ہمہ گیری پیدا ہو جاتی، خیالوں میں ایک طرح کی ناقابل برداشت خنکی، تصور میں لامحدود ٹھہراؤ اور امنگوں پر مسکراتی کیفیت چھا جاتی، اور دھیرے دھیرے یہ طلائی و نقرئی کرنوں کا امتزاجی دھندلکا

گہری ظلمتوں کے جال میں پھڑپھڑا کر دم توڑ دیتا، اسے اپنے گلے میں کوئی نوکیلی چیز چبھتی ہوئی محسوس ہوتی، دماغ میں کوئی پتھریلی سی شئے گردش کرنے لگتی، دھڑ، دھڑ نفرت تکلیف سے وہ کراہ اٹھتا، اور جب آنکھیں کھولتا تو ایک لمحے کے لئے اسے محسوس ہوتا وہ قطعی بے رنگ و بو ہے، بے نام ونشان، پتھریلا، بے حس، بے روح، جس کا کوئی مقصد نہیں، کوئی مرکز نہیں، کوئی منزل نہیں نہ کوئی جادہ ہے۔ بس وہ ہے مگر نہ ہونے کے برابر —— لیکن دوسرے لمحے جب وہ سوچتا کہ ایسا کیوں ہے ——؟ تو دھیرے دھیرے اس کے جسم میں سویا ہوا عناصر کا ظہور ترتیب بیدار ہو جاتا آپ ہی آپ اس کے تخ آلود ہونٹوں پر ایک ناکام سی طنزیہ مسکراہٹ پھیل جاتی۔ اسے اپنے جوڑ جوڑ میں ایک میٹھی میٹھی مندی مندی کسک کی محسوس ہوتی۔ اور ایک ایسی لہریلی روانی جیسے سگریٹ سے نکلتے ہوئے دھوئیں کی لکیر، پھر وہی بھولا، بسرا اندوجزر اس کے ذہنی افق پر نمودار ہو کر تھرتھراتا اور ایک پل کے غیر واضح ارتعاش کی مبہم سی یادوں کو لیکر پھر لاشعور کی اتھاہ گہرائیوں میں کھو جاتا، ڈوب جاتا۔ سو جاتا......

"بھائی جان —— وہ آپکو خالہ جان نے بلایا ہے ——" فرحت اسکول کی کتابیں شیلف پر بے دردی سے پھینک کر باورچی خانہ کی طرف لپکتا ——

سنو —— وہ مدکتا —— کیوں بلایا ہے ——؟

معلوم نہیں —— کہا تھا بھیج دینا۔

"کس نے؟"

"نسرین آپا نے"

اچھا —— اس کے دل میں گدگدی ہونے لگتی، لیکن فرحت اس طلبی کے پس پشت کار فرما ہاتھ کی چابکدستی اور اس کی جوازی لذت سے بے نیاز اسٹینڈرڈ بیکری کی نفیس پیسٹری اور دارجلنگ کی خوشبودار چائے کی لذت میں گم باورچیخانہ کا رخ کرتا —— معاً اس کے ذہن میں ہندستانی عورت کی سوشل اہمیت اور حیثیت کا مبہم سا خاکہ ابھرتا اور عورت کو سماجی احتساب کے غیر مساوی اور آہنی سلاسل میں جکڑا ہوا دیکھ کر اس کے دل میں عورت کے لئے ایک موہوم ہمدردی لیکن سماج کے اس خود غرض اور اجارہ دارانہ فعل کے لئے نفرت اور غم وغصہ کی شدتناک لہریں تندی کے ساتھ پھیل جائیں —— اور جب وہ خالہ جان کے یہاں پہنچتا تو وہی سکڑاؤ، وہی لجاجت، وہی شرماہٹ اور رخساروں سے پھوٹتی ہوئی وہی تمتماہٹ شفق کی لالی، آنکھوں میں بھڑکتے ہوئے شعلے، چھلکتی ہوئی شراب اور ماتھے پر جھلملاتی ہوئی بوندیں، باریک باریک موتی، جھپ جھپ جھپکتی ہوئی پلکیں..... سکوت، اجتناب، گریز، خاموشی..... وہ چوری سے نسرین کی طرف دیکھتا اور نسرین اس کی طرف نگاہوں کے ٹکراؤ سے پہلے ہی وہ دوسری طرف رخ کر لیتی اور وہ دوسری طرف، —— نسرین کی نرگسی آنکھیں دور کہیں، افق سے بھی پرے، دھندلکوں کی خلاء میں کسی چیز کی جستجو میں کھو جاتیں، —— وہ دل میں سوچتا —— تو پھر ——؟ اور وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی وہ نہیں جان پاتا —— بلکہ ایک لایعنی دباؤ، ایک مبہم سا خوف، ایک نامعلوم سا خدشہ، ہمیشہ کی طرح اس کے دل میں شعلہ کی مانند بھڑک اٹھتا —— بیٹھے بیٹھے کبھی تنہائیوں میں، اپنی ان نمایاں تبدیلیوں کو محسوس کر کے وہ سوچتا کہیں نسرین کی آنکھوں نے اسے تخیل کے عمیق سمندر تو عطا نہیں کئے، جن میں ڈوب کر وہ زندگی کے اس قدر قریب پہنچ گیا ہے کہ صداقتوں کی جواں سال کلیاں محض اسی کی خاطر مسکرا رہی ہیں ——————

سچائی کے گیتوں کی لے میں اس کی روحانی شادمانی کا خلوص ناچ رہا ہے، کہیں نسرین کی پلکوں کی مبہم جھپکن نے تو

اس کے دل کو دھڑکنا نہیں سکھایا، کہیں اس کی یادوں کی بدولت تو اس کی راتیں پُرتبسم اور دن تابناک نہیں —— کہیں اس کے خوابوں کے لئے تو اسے نیند نہیں آتی ——؟؟؟ پھر آپ ہی آپ اس کے جسم میں اونگتا ہوا نڈھال جمیل بیدار ہو کر کہتا۔ ہشت۔ ہونہہ نسرین، کوئی کوہ قاف کی پری ہے، یا جنّت کی حور۔ جو اس کی وجہ سے وہ..... ہونہہ! لیکن ایک روز جمیل نے بُری طرح شکست کھائی۔ یقیناً نسرین کے دم خم سے اس کی دنیا آباد تھی۔ اس کے تنفس میں صحت مند خوشبو، اور تخیل میں حیات آفریں وسعت تھی، تب ہی تو..... اس نے کہا ——

"کیوں؟ چور کہیں کی ——" اس کی آوازیں تازہ دم اُمنگیں ناچ رہی تھیں، ایں ——؟ اوں ——؟؟ گھبراہٹ میں وہ کوئی جواب بھی نہ سوچ سکی۔ کیا ——؟ وہ امید اور مایوسی کے دوراہے پر ٹھٹھکا کھڑا تھا، نسرین نے اس کی طرف دیکھا، اف ——! ایک سُرخ سی خونی لکیر اس کے دل میں تیر بن کر اترتی چلی گئی، حسین ارمان، اُمنگیں، تمنائیں، شوق، التجا اور ایک غیر معروف سی گلابی چمک تھی جیسے برف کی قاش سے جھانکتی ہوئی شفق کی لالی، وہ تڑپ اُٹھی، اس کے سینہ میں مدوجزر پیدا ہو گیا اور معاً اسے محسوس ہوا جیسے اس کے دل میں کسی نے زور سے چٹکی بھر لی ہے...... وہ جلدی میں دوپٹہ کا پلو سنبھالے بغیر کمرے سے بھاگ گئی۔

جمیل کے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں چھپی ہوئی صدیوں کی برفیلی سانس، اٹکتی ہوئی، کھٹکتی ہوئی، سینے میں چمک سی پیدا کرتی ہوئی ابھری اور ابھر کر فضا میں غیر مرئی ابخرات کی طرح تحلیل ہو گئی..... لیکن یہ رکتی، کھٹکتی ہوئی سی سانس کسی رنج و غم، افسوس اور اضمحلال کی پروردہ نہیں تھی اور نہ ہی کسی افسردگی کے اظہار کا ذریعہ تھی بلکہ یہ ایک ایسا لہریلا آئینہ تھی چمکتی ہوئی، چمکاتی ہوئی، ایک لبریز پیمانہ تھی چھلکتی ہوئی، چھلکاتی ہوئی، اور ایک ایسا ناتمام کیف، ایک ایسا ابدی نشہ اور لافانی خمار جیسے رم جھم بوندیں پڑ رہی ہوں، جیسے شبنم میں نہائی ہوئی کلیاں مسکرا رہی ہوں —— ، جیسے چوری چوری، چپکے چپکے آنکھیں لڑانے والا چاند دل میں اتر آیا ہو.....

اس روز کے بعد، اس کے دل دماغ اور ذہن میں ہر وقت ایک ہیجان سا برپا رہنے لگا، کائنات کی ہر ایک شے میں نسرین کا پرتو، نسرین کا خیال، نسرین کی یاد، نسرین کی پسند، اس کی شرماہٹ، اس کی مسکراہٹ، اس کی آواز، اس کا رنگ غرضیکہ ہر ایک چیز پر نسرین کا قبضہ تھا، لیکن یونہی ذہنی طور پر —— جب وہ اکیلا ہوتا تو اس کے ساتھ نسرین ہوتی اور جب اس کو تنہا لوگ ہوتے تو وہ اکیلا ہوتا، اس ذہنی تضاد —— کے افق پر نگاہ ڈالتے ہی اس کے دل میں ایک طرح کی شادماں کپکپی، رنگین ارتعاش اور ایسی خوشبودار تھرتھری ہوتی جس کو محسوس کر کے وہ اپنے آپکو ساتویں آسمان کی رفعتوں سے بھی بلند دیکھتا۔ بہت سی جھنجھناتی ہوئی گھنگھروؤں سے مشابہ صدائیں رس بھرے، ہونٹوں سے نکل کر اس کے دل کی گہرائیوں میں امرت رس گھولنے لگتیں۔ نسرین اس کے رنگ میں رچ چکی تھی اس کی تمام جمالیاتی، مشاہداتی، شعور اور ادراکی تمام قوتیں، نسرین کے محور پر تیزی سے گھوم رہی تھیں، —— لیکن اس کے باوجود اس کے دل میں ایک مبہم سا خدشہ برابر بھڑک رہا تھا، محض اس لئے کہ شاید اس کی محبت نوخیز تھی، اور سماجی اصولوں سے بغاوت کی نشان راہ تھی، یا شاید اس لئے کہ وہ اپنی پوری یگانیت کیساتھ محبت کرنا چاہتا تھا مگر ایسی بلند و بالا محبت کبھی کی نہیں تھی، یا نسرین شاید پہلا ساحل تھی جس سے اس کے جذبات کی موجیں والہانہ طور پر ٹکرانے کیلئے بےچین تھیں، تڑپ رہی تھیں، —— لیکن بس ٹکرانے کی ہمت نہیں تھی، یا ٹکرانے سے معذور تھیں، یا ٹکرانے ڈرتی تھیں، ساحل کی قربت اور بلندی کو دیکھکر، کہیں ٹکرا کر واپس نہ لوٹ آئیں، کہیں سرنہ پڑ جائیں، کہیں مر نہ جائیں، اور موت کے تصور سے اس کا دل ڈوبنے لگتا، روح اُداس ہو جاتی، دھڑکنیں سو جاتیں، وہ خطرے کی پرالم گہرائی اور خطرناک

شدت سے گھبرا کر پیچھے ہٹ جاتا، نیچے تا حد نگاہ ظلمتوں کا جال پھیلا ہوا دیکھکر اس کے رہے سہے ہوش بھی فنا ہو جاتے۔ لیکن اس بعد جلنے کیوں ہی اس کے دل میں جماہوں کے دیتے پھوٹ پڑے اور وہ ...... دفعتاً اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی، گال پر خون جھلک آیا، آنکھوں میں چنگاریاں بھرنے لگیں، اسنے خجالت تاب نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا اور گال سہلانے لگا۔ "بھائی جان، تفریح سے ذرا جلد واپس آ جائیے گا، سینما چلیں گے" نزہت نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ اس نے فوراً گال سے ہاتھ ہٹا لیا "ایں؟" "ہاں ذرا جلدی ڈاکٹر کوشس دیکھنے چلیں گے نا" "ڈاکٹر کوٹنس، ہاں ضرور، ضرور، مگر نزہت، وہ بات یہ ہے کہ میں نہیں جا سکونگا" "کیوں؟" "یونہی ... بس ... یونہی، دراصل ہمارے ہندوستان میں ایسے ڈاکٹر کوٹنس بکھرے پڑے ہیں، مگر انکی کوئی قدر نہیں، کوئی وقعت نہیں، وہ گندی نالیوں میں، پھٹے ہوئے کپڑوں سے بھی بدتر زندگی بسر کر رہے ہیں، کوئی بازاری حکیم ہے، کوئی پوسٹر چپکا رہا ہے کوئی اخبار بیچ رہا ہے، کوئی ... کوئی نسرین ہے، کوئی جوتوں پر ..." "توبہ ... پھر وہی شروع کر دی فلسفہ طرازی، آپ سے کوئی بات کرنا قیامت ہے، نہیں جانا ہے تو مت چلئے، آپکے ہاتھ کون جوڑتا ہے، وہ تو نسرین نے کہا، کہ اگر آپ بھی چلیں تو اچھا ہے، ٹکٹ ملنے میں آسانی ہو جائیگی۔ خیر اب ... اور یوں بھی احمد عباس کی کہانی ہے ... ورنہ میں بھی ... آپ چلیں گے یا نہیں؟ ..." "نہیں" اس نے بادل ناخواستہ کہدیا، یوں نزہت کی خاطر تو وہ چلا بھی جاتا، مگر نسرین کے تصور سے اس پر ایک عجیب قسم کی کیفیت طاری ہو گئی، نیم شعوری۔ نزہت برا مان گئی، مگر وہ نہیں گیا، اور جاتا کس منہ سے، نسرین تو ... وہ دیوانوں کی طرح ادھر ادھر گھومتا رہا، کتابیں دیکھتا رہا، افسانہ لکھتا رہا، اور ٹکٹکی باندھے تاروں بھرے آسمان کو گھورتا رہا، حتّٰی کہ بارہ بج گئے، اس نے آہستہ سے لیمپ کی بتی مدھم کر دی، اور چپ چاپ ڈھال، مضمحل، پریشان، اداس بستر پر لیٹ گیا، آنکھیں بند کر لیں، چہرے کو بازو میں چھپا لیا، کوئی ساڑھے ۱۲ بجے دروازے پر آکر تانگہ رکا، نزہت فرحت، اور بھائی جان کی ملی جلی آوازوں میں ایک باریک سی، جانی پہچانی چہکتی آواز اور بھی تھی، اس چہکتی آواز کو سنکر اس کو اپنے سینے میں اضطراری لہریں آپس میں ٹکراتی ہوئی محسوس ہوئیں، وہ بستر میں اس طرح دبک گیا گویا کسی کے خوف سے چھپا ہو۔

گرمیوں کی چاندنی رات، مالوے کی خنک ہوا، تنہائی، اداسی، سناٹا، گرغ، نیچے صحن میں سب محوِ خواب تھے، ایک وہی تن تنہا مکان کی کشادہ چھت پر پڑا کروٹیں بدلتا ہوا سوچ رہا تھا، نسرین اور اس کا عمل بیہودہ عمل ...... اس کی سوچ کا پھیلاؤ برابر پھیل رہا تھا، حتّٰی کہ اس کی آنکھوں کے پپوٹے بوجھل ہونے لگے۔ آنکھوں کی پتلیاں چکرانے لگیں، اعضاء ایک ایک کرکے اس کا ساتھ چھوڑنے لگے — اچانک نیچے کمرے میں لگی کلاک چیخی جیسے احتجاج کر رہی ہو اس سکوت اور پُر الم ماحول کے خلاف، پھر اسے اپنی پیشانی پر مدھم سی خنکی کا احساس ہوا اور ایک بے نام سا لمس جو بڑھتا گیا اور ہلکے سے دباؤ میں تبدیل ہو گیا۔ اس نے آہستہ سے آنکھوں سے بازو ہٹایا اور چونک کر ایکدم اٹھ بیٹھا، تم، تم۔ نسرین؟ نسرین، ایک نئی نویلی دلہن کی طرح سکڑی سکڑائی کھڑی تھی اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے اسکی جھکی جھکی پلکیں جھپک رہی تھیں۔ دل میں دھڑکن عرق آلود جبیں اور نیچے صحن میں سب لوگ محوِ خواب تھے۔ "جی" اسنے بمشکل کہا۔ "کیا آپ ہم سے ناراض ہیں" اس کی آواز میں ٹوٹے ہوئے تاروں کی جھنکار تھی اور امنڈتے ہوئے آنسوؤں کا شور۔ لیکن اس وقت "لاشعوری طور پر اس کا ہاتھ بکھرے ہوئے بالوں کو سنوارتا ہوا گال پر رک گیا۔ "کوئی دیکھ لے تو" "دراصل میں ... میں، بہت شرمندہ ہوں" یکایک اس کے دل میں ایک لہر سی اٹھی۔ خدایا کیا یہ وہی نسرین ہے غارتگر ہوش و حواس، سرد مہر، بے وفا، جس نے اسکے گال پر طمانچہ مارا تھا، جسنے اسکی محبت کو ٹھکرایا تھا، جس نے اس کے خلوص کو گالی دی تھی "میں معافی مانگنے آئی ہوں" اسکی آواز بری طرح کانپ رہی تھی۔

وہ چپ رہا۔ اور اس کی آرزوؤں کا مرکز، اسکی تمناؤں کا چاند، اس کے تخیل کی ملکہ اسکے سامنے مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑی تھی، مہر بلب حکم کی منتظر، اف، اسنے بڑھ کر اس کا گرم گرم اور ریشم کی طرح ملائم ہاتھ تھام لیا اور جذبات کی شدت سے گھٹی ہوئی آواز میں بولا۔ نسرین —؟ جواب میں ٹپ سے ایک بوند اسکے ہاتھ پر گری، نسرین کے ہونٹ کانپ رہے تھے اور خوشبودار سانسوں کا تموج لہرا رہا تھا — اس نے دیکھا دور آسمان کی بیکراں وسعتوں میں کہکشاں کی لڑیاں کانپ رہی تھیں اور افق کے بعیدی کناروں سے سنہرا غبار پھوٹ رہا تھا۔

جائزے

سرمایہ دارانہ نظام کا مستقبل

ادب زندگی کی تخلیق کرتا ہے اور زندگی ادب کی خالق ہے!۔

انجم صہبائی

سرمایہ دارانہ نظام کا مستقبل

اس نظام کی قدروں اور اس کے مستقبل سے متعلق پچھلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء) کے بعد سے انسانی دل و دماغ میں شکوک و شبہات پیدا ہونے لگے اور ان شکوک و شبہات نے شدید صورت اختیار کر لی جبکہ اشتراکیت کے علمبردار لینن اور ٹراٹسکی کی کوشش رنگ لائیں اور ۱۹۱۷ء میں روس میں انقلاب ہوا جس میں خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ قریباً ۳۶ ہزار آدمی موت کے گھاٹ اتارے گئے اور اشتراکیت کا نظام روسی سرزمین پر سانس لینے لگا۔ مملکتی سرمایہ دارانہ نظام کے علاوہ انصرام جنگ کے سلسلہ میں حکومت خاص جنگی اغراض کی بجاآوری کے لئے ملک کی صنعت و حرفت، تجارت و زراعت پر اپنا اقتدار قائم کر لیتی ہے اور اسی سے آگے چلکر اشتراکی نظام کی داغ بیل پڑتی ہے، حکومتیں یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہیں کہ جنگ کے خاص حالات نے جس شکل و صورت سے انھیں دوچار کر دیا تھا (یعنی ہر چیز پر حکومت کا تسلط کلی)۔ کیا اس زمانہ میں بھی اسی طریقۂ کار سے کام چلایا جا سکتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کی حقیقت یہ ہے کہ اس نظام کے تحت ذرائع پیداوار سوسائٹی کے ایک قلیل التعداد طبقہ کے تحت ہوتے ہیں اور سوسائٹی کے کثیر التعداد افراد کا انحصار اجرت پر ہوتا ہے، ان کی زندگی کا دارومدار Day to day wages پر ہوتا ہے۔ آجر اور مزدور کا طبقہ خود بخود ابھر آتا ہے، آجر ہر حیثیت سے طاقتور ہوتا ہے اور مزدور اس کے مقابلہ میں کمزور اور بے بس ہوتا ہے اور غیر یقینی عناصر گھل مل کر ہر وقت اس کی زندگی اجیرن کئے رکھتے ہیں کیونکہ جو چیزیں پیدا کیجاتی ہیں وہ مقامی بازاروں کے لئے نہیں بلکہ بین الاقوامی بازاروں کے لئے ہوتی ہیں، خود کفیل پیداوار کا دور دورہ نہیں ہوتا۔ اس طرح سرمایہ دارانہ نظام کے تحت ان حالات میں معیشت بین الاقوامی بازاروں کے تحت ہوگی، دنیا کے کسی ملک یا کسی چپہ پر جنگ ہو تو اس سے سب یکساں متاثر ہوتے ہیں، بین تجارتی حالات بھی متاثر ہوتے ہیں اور اس طرح مزدور کی زندگی بین الاقوامی تغیرات کی چکی میں پستی رہتی ہے۔ اس نظام میں بڑے بڑے کاروبار چند اشخاص کے ہاتھوں میں آ جاتے ہیں اور اسی طرح "ٹرسٹ" اور "کرٹیلز" کا قیام عمل میں آتا ہے اور ان کی حیثیت اجارہ کی سی ہو جاتی ہے نتیجتاً کسی چیز پر "مونوپلی" حاصل کرنے اور انفرادی منافع کی حرص و ہوس پر رینگنے سے سوسائٹی کی مشین میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے اور دنیا کو کساد بازاری کا سامنا کرنا پڑتا ہے "امپیریلزم" بھی "کیپیٹلزم" کے ایک "رفیق" کے طور پر ترقی کرتا ہے اور آگے چل کر بیرونی ممالک میں "کیپیٹل ایکسپورٹ" کے ساتھ ساتھ "پولیٹکل ڈومینیشن" بھی رفتہ رفتہ زور پکڑ جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ اس نظام کے تحت لوگوں میں پس اندازی کی عادت بڑھتی ہے۔ آزاد مسابقت کی وجہ سے کمزور اپنی موت آپ مر جاتے ہیں اور انفرادی صلاحیتوں کو ابھرنے اور اجاگر ہونے کے اکمل ترین مواقع حاصل ہوتے ہیں۔

اس طرح سرمایہ دارانہ نظام کے تحت کارخانے، فیکٹریاں، بنک اور دولت سمٹ سمٹا کر ایک چھوٹے سے طبقے کے ہاتھوں بکجا تی ہے، اور مزدور اور کسان اپنی قوت و محنت بیچ کر ان کے زرخرید غلام بنجاتے ہیں اور زندگی بھر سرمایہ دار طبقہ کی بنی بنائی ظالم دنیا کے اردگرد کولھو کے بیل کی طرح گھومتے رہتے ہیں۔ بس اس نظام کی بنیاد پر دو تاریک حلقہ کی

لوٹ کھسوٹ اور "ایکسپولائٹیشن" پر رکھی جاتی ہے، دولت کی انفرادی ملکیت ہونے سے تمام حلقوں میں دولت مساویانہ طور پر تقسیم نہیں کیجاتی اور نتیجتاً، افلاس، نکبت، بیروزگاری اور جہل سوسائٹی کے ایک بڑے حصہ پر بلائے بیدرماں بنکر چھاجاتے ہیں اور چونکہ ذرائع پیداوار و دولت کی انفرادی ملکیت پر قائم کئے جاتے ہیں اس لئے عدم مساوات اور بیروزگاری کا ذمہ دار بڑی حد تک یہی سرمایہ دارانہ نظام ہے جو عوام کا خون جونک کی طرح چوسے اور دیمک کی طرح چاٹے جارہا ہے۔ اس نظام میں اشیاء کی پیداوار کے وقت یہ نہیں دیکھا جاتا کہ یہ عوام کی ضروریات کو کس حد تک پورا کرینگے بلکہ اس کے پس منظر میں ہمیشہ سرمایہ داروں کے ذاتی منافع کا جذبہ ناچار رہتا ہے اور اس طرح اس نظام کی مشین ذاتی منافع کے کل پرزوں پر چلتی رہتی ہے، دولت، ذرائع پیداوار، سیاسی اقتدار اور معاشی قوت ان سب پر سرمایہ دار پیر پھیلائے موج اڑاتے رہتے ہیں اور دوسری طرف عوام کے ہاں صرف ان کی زندگی کا سہارا قوت، محنت ہوتی ہے اور جس کو وہ ان گدھوں کے ہاتھوں ٹکے کے داموں فروخت کرڈالتے ہیں، پھر بھی ان بدنصیب انسانوں کو ایک وقت کے لئے پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی، سر چھپانے کو ٹوٹی پھوٹی چھت نہیں ملتی اور جسم ڈھانکنے کو دوگز کفن میسر نہیں آتا۔!

سرمایہ دارانہ نظام میں خانگی ملکیت افراد کی ہوتی ہے اور افراد کو اپنی ملکیت "اکوائر" اور "ڈسپوز" کرنے کا پورا پورا اختیار رہتا ہے، محنت کے علاوہ دوسرا "انسٹی ٹیوشن" وراثتی نظام کا ہے، وراثتی نظام کی بنیاد پر جائداد اور ملکیت بغیر محنت کے وراثتاً یکے بعد دیگرے منتقل ہوتی رہتی ہے، تنظیم، اصل، سرمایہ اور دیگر عاملین پیداوار پر بھی خانگی ملکیت کا رواج ہوتا ہے اور جب تمام ذرائع پیداوار پر چند افراد کا اختیار ہوتا ہے تو آگے چلکر "اسٹیٹ کیپٹلزم" کی شکل وجود میں آتی ہے، اس کے علاوہ سرمایہ دارانہ نظام میں آزادانہ مسابقت ہوتی ہے "فری کامپیٹیشن"، مختلف پارٹیاں ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کی ممکنہ سعی کرتی ہیں، کارخانہ دار دوسروں کو میدان سے ہٹانے اور اصل دار مختلف کاروبار میں اصل لگانے کی کوشش کرتے ہیں اور مختلف، غلط اور خطرناک پہلوؤں اور زاویوں کا سہارا لیکر ان اشیاء کی "مارکٹ کیپچر" کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی مطابقت کی دوڑ دھوپ میں بعض دفعہ یہ لوگ اندھادھند دوڑ کر کمسے کم مصارف سے اشیاء پیدا کرتے ہیں اور ——— ناقص اشیاء دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں ادنیٰ اجرتوں اور دیگر سیاسی ذرائع کے بل بوتے پر "مارکٹ کیپچر" کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور اس طرح کمزور مقابلے کی تاب نہ لاکر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں یا پھر آخری قطرۂ خون تک مقابلہ کرکے تباہ و تاراج ہوجاتے ہیں، یا پھر اپنے آپکو بڑے کاروباروں میں "امل گیمیٹ" کردیتے ہیں، اس مسابقتی دوڑ میں فرسودہ طریقوں کو چھوڑ چھاڑ کر نت نئے میکانی ایجادات سے کام لیا جاتا ہے اور کئی ایک طریقوں سے حریفوں کو میدان جنگ سے ہٹانے کی سعی کیجاتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ لوگ اس وقت اس مقولہ پر جنون کی حد تک عمل پیرا ہیں کہ "محبت اور جنگ میں ہر ایک چیز جائز ہے" سرمایہ دارانہ نظام میں آجر اور مزدور میں ہمیشہ ٹھنی رہتی ہے، آجر جو ہر حیثیت سے مزدور کے مقابلہ میں طاقتور ہوتا ہے مزدور کو حشرات الارض کی طرح کچلنے اور برباد کرنے کی کوشش کرتا ہے اور مزدور اقبال کے اس شعر کی تفسیر بنکر رہجاتا ہے ؎

میری دنیا میں تیری پادشاہی ٭ تیری دنیا میں مَیں محکوم و مجبور

کیونکہ مزدور کی زندگی کا دارومدار اس کی اپنی اجرت پر ہوتا ہے اور اس کا سرمایہ اس کے ہاتھ پاؤں ہوتے ہیں، کسادبازاری اور "اسٹرائک" کے زمانہ میں تو فاقے کے کالے کالے بھوت، نکبت و افلاس کی چڑیلیں اسے آدبوچتی ہیں۔ مشین کی ترویج سے اس پر ظلم کے نت نئے پہاڑ ٹوٹ پڑتے ہیں اور مزدوروں کا ایک بڑا حلقہ بیروزگار ہوجاتا ہے، گوکہ یہ کہا جاتا ہے کہ یہ چیز "ٹرانزیشنل" حیثیت رکھتی ہے اور عبوری دور کے گذر جانے کے بعد خود "مشین انڈسٹری" میں ہزارہا مزدور کھپ جاتے ہیں۔

لیکن بہرحال مزدوروں کا ایک بڑا پرسنٹیج بیروزگار بن کر رہ جاتا ہے، مزدوروں کی بارگیننگ پاور کم ہوتا ہے لیکن اب سرمایہ دار ملکوں میں مزدور بڑی حد تک ترقی کر چکے ہیں اور انھوں نے اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے مزدور سبھائیں قائم کر لی ہیں جن کا ایک جال پوری دنیا پر پھیلا ہوا ہے، لیکن پھر بھی پورے طور سے مزدور آج بھی مطمئن نہیں ورنہ آج تک ان کے تمام دکھوں کا علاج ہی ہو سکا ہے، سرمایہ دار طبقہ چونکہ طاقتوں کا مخزن ہوتا ہے اس لئے وہ جلد ہی حکومت پر بھی اقتدار حاصل کر لیتا ہے۔ اس طرح معاشی میدان جیتنے کے بعد وہ سیاسی میدان پر بھی اپنا پنجہ گرفت مضبوط کر لیتا ہے، غیر مساوی قوت رکھنے والے حلقہ میں مسابقت کا دور دورہ ہوتا ہے اور نتیجتہً اقتدار اور قوت رکھنے والا طبقہ پراسرار ہو جاتا ہے اس طرح اس طبقہ کو ظلم و استبداد کی پوری پوری آزادی حاصل رہتی ہے غرض، اس نظام کے تحت مجبوروں کی ایک ایسی دنیا جنم لیتی ہے جس کے شمال جنوب مشرق اور مغرب پر سرمایہ دار گدھوں کا راج ہوتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کے تحت عرصہ دراز تک حکومت نے 'لیسی فیئر' کی پالیسی اختیار کر رکھی تھی جس کی وجہ سے سوسائٹی کو بہت نقصان پہنچا، علاوہ ازیں نظریۂ انفرادیت نے بڑی تباہیاں پھیلائیں، اس نظریہ میں اس بات کا پرچار کیا جاتا ہے کہ دولت کی تقسیم کو قانون قدرت کے تحت چھوڑ دیا جائے۔ گلاڈسٹن اس نظریہ کا حامی تھا اور اس نظریہ کو پیش کرنے والا آدم اسمتھ تھا۔ اس نظریہ کے نتیجے کے طور پر دولت سمٹ سمٹ کر تیس فیصدی آبادی کے پاس جمع ہو گئی اور قریباً ۷۰ فیصدی آبادی بھوک، پیاس، نکبت اور افلاس کے کفن میں لپٹی لپٹائی سڑنے لگی، ایک طرف بڑی بڑی عالیشان فلک بوس عمارتیں کھڑی ہو گئیں اور دوسری طرف 'سلمس' ابھر آئے، جہاں فاقے اور بھوک اور آہ و زاری ہر وقت اپنا وحشی ناچ ناچتی رہتی ہے، جہاں دنیا بھر کی بیماریاں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنا قبضہ جماتی ہیں، جہاں گندگیاں پلتی ہیں، جہاں آنسوؤں کے سوتے ابلتے ہیں اور سیکڑوں لاشوں کو کیڑوں مکوڑوں کی طرح موت کی کالی کالی گھاٹیوں تک بہا لیجاتے ہیں۔

۱۹ویں صدی سے ایک اور نظریہ پیدا ہوا جس نے شدومد سے سرمایہ دارانہ نظام کی مخالفت کی اور کہا کہ یہ نظام ہماری سوسائٹی کو گھن لگا رہا ہے، ہماری سماجی اور اقتصادی ترقی کی راہوں میں روڑے اٹکا رہا ہے اس نظریہ کو اشتراکیت کہتے ہیں۔ "کارل مارکس" نے ایک کتاب لکھی ہے "Dus Capital" جس کو "Bible of Socialism" بھی کہا جاتا ہے، یہ اشتراکیت پر بنیادی اور مشہور عالم کتاب ہے۔ اس طرح اشتراکیت کا پرچار چاردانگ عالم میں ہونے لگا۔ کارل مارکس سے ایک صدی پہلے Gold Smith نے تقریباً یہی نظریہ ان الفاظ میں پیش کیا تھا:۔

Ill fares the land, to
hast'ning ills a prey,
where wealth accumulates
and men decay.

اس نظام کو پیش کرنے سے اشتراکی خیال و تصور کے پرچار کے لئے کئی 'International' یا بین الاقوامی ہو چکے تھے، انھوں نے بتایا کہ انفرادیت اور آزاد مسابقت کی وجہ سے سوسائٹی تباہ ہو رہی ہے اور اس نظام کے تحت جمہوریت اور عمومیت کا جو راگ الاپا جا رہا ہے وہ ایک سراب اور دھوکہ کی ٹٹی ہے، چنانچہ جمہوریت کے متعلق

شہور جرمن فلسفی نطشے کہتا ہے کہ " یہ اعلیٰ درجے کے آزاد افراد کی سرکوبی کا ایک طریقہ ہے " اور مفکر مشرق علامہ اقبال فرماتے ہیں " یہ دیو استبداد ہی ہے جو جمہوری قبا میں رقصاں ہے "

اشتراکیت کا مقصد یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کی تمام خرابیوں کو دور کیا جائے، اس طرح کہ حکومت کا دائرہ وسیع سے وسیع ہو، خانگی ملکیت (Private Property) کو بالکلیہ ختم کر دیا جائے۔ عاملین پیدائش ایک قاعدے کے تحت جکڑ دیئے جائیں، کارخانوں کے لئے قوانین بنائے جائیں اور کاشتکاروں کے حقوق کا قانونی تحفظ کر دیا جائے، دولت کی مساویانہ تقسیم عمل میں آئے، کوئی بھوکا نہ مر سکے، کوئی شخص کسی کو " ایکسپولائٹ " نہ کر سکے معاشی، سیاسی علمی اور اخلاقی میدان جو صرف سرمایہ داروں کے ہاتھ میں جکڑے ہوئے تھے ان سے سب کو فائدہ اٹھانے کے مواقع فراہم کئے جائیں۔ یہ سرمایہ دارانہ نظام کی ان گنت خرابیاں تھیں جس نے حقیقت میں طبقہ واری جنگ —— میں شدت پیدا کر دی، انسان اور انسان کے درمیان خلیج حائل کر دی۔ موجودہ زمانے میں اشتراکی نظام کی تصویر آپ کو اشتراکی روس میں ملیگی، جس میں بڑی حد تک سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیوں کو دور کیا گیا ہے۔ یہاں اشتراکی بنیادی قوانین کے تحت زمین، کارخانے، بینک، ریلیں اور کانیں اہل روس کی مشترکہ ملک ہیں چنانچہ اس " سوشل " نظام کے تحت ریاست اور حکومت عوام کی ہے۔ عوام کی پوری دولت کی نگرانی اور تقسیم حکومت اور ریاست کرتی ہے۔ ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد روس میں جب یہ نظام قائم ہوا تو خود بخود جاگیردار اور مہاجن ہٹ گئے۔ پرولتاریہ طبقہ کی حکومت قائم ہو گئی اور بڑی حد تک سرمایہ دارانہ نظام کے تاریک و مہلک اجزاء بیروزگاری۔ دولت کی غیر مساویانہ تقسیم۔ Exploitation، عصمت فروشی وغیرہ کا سدباب ہو گیا، اس طرح سرمایہ دار ممالک جو اپنی جمہوریت اور عمومیت پسندی کا رونا روتے ہیں وہ صحیح معنوں میں اس نظام کے تحت قائم ہوئی ؟ ابراہیم لنکن کے الفاظ میں 'Government of the people for the people by the people' دنیا کے دو زبردست سرمایہ دار ممالک امریکہ اور انگلستان ہیں جو اپنے آپکو Arsenal of Democracy کہتے ہیں، لیکن حقیقت کا پردہ تار تار کیا جائے تو انگلستان کی چھ فیصدی آبادی اس ملک کی ۸۰ فیصدی آبادی کے سرمایہ پر قبضہ جمائے عیش منا رہی ہے۔ اور طرفہ تماشہ یہ کہ حکومت، پارلیمنٹ، سیول سروس اور ریاست پر انہیں کا طوطی بولتا ہے۔ اور ادھر امریکہ کو دیکھئے جہاں دو فیصد آبادی امریکہ کی ۵۰ فیصد دولت پر قابض ہے، اور کانگریس سنات، مالیہ، صنعت و حرفت بھی انہیں کے ہاتھوں میں ہے۔ امریکہ میں اس وقت ۱۰ لاکھ آدمی بیروزگار ہیں اور موجودہ جنگ کے اختتام پر ہر ہفتہ اُنکی تعداد میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔

انیسویں صدی کے بعد خیالوں نے اپنا رُخ بدلنا شروع کیا۔ ایک طرف اشتراکیت وجود میں آئی۔ اور دوسری طرف سرمایہ دارانہ نظام پر جب بہت سے دے ہونے لگی تو د h Eyewa) کے طور پر سرمایہ دار ممالک سرمایہ دار نظام کی خرابیوں کو دور کرنے کی جانب مائل ہوئے۔ اور اس طرح اجتماعیت Collectionism ملکتی اشتراکیت، State Socialism پیشہ سری Syndicism۔ گلڈ اشتراکیت Guild Socialism، نے جنم لیا۔ ان نظاموں پر میں ایک طائرانہ نظر ڈالونگا کیونکہ انکی تفصیلات پر تبصرہ کرنا میرے اس مضمون کا مدّعا نہیں ہے۔ اجتماعیت کے تحت عاملین پیدائش کو قانون کے پنجہ میں جکڑ دیا جاتا ہے، یہ ایک اعتدالی طریقہ کار ہے اس میں دولت کی تقسیم ہموار کرنیکی زیادہ سے زیادہ کوشش کی جاتی ہے۔ اس پر آج کل برطانیہ عمل پیرا ہے۔ یہ اعتدالی پیش نامہ سو سال پر پھیلا ہوا ہے، جس کے بعد یہ خیال کے

دولت رفتہ رفتہ عام طبقات میں مساویانہ منقسم ہو جائیگی، حالانکہ اس میں سرمایہ دار بہرحال سرمایہ دار ہی رہتا ہے اور مزدور مزدور ہی رہتا ہے، ذہنیتوں کو بدلنے کے لئے انقلابی عناصر کا ہونا ضروری ہے۔ دوسرا نظام مملکتی اشتراکیت کا ہے۔ اس پر فاسسٹی اور نازی جرمنی اور اٹلی عمل پیرا تھے۔ اس نظام کے تحت نہ صرف عاملین پیدائش پر کنٹرول قائم کیا جاتا ہے بلکہ ایک پروگرام بنا دیا جاتا ہے۔ اور تقسیم کار اور تقسیم دولت بہتر معنوں میں ہوتی ہے۔ ان فاسسٹی حکومتوں کا تصوّر تھا کہ افراد، مملکت کے جزو ہیں، مملکت کا ایک دماغ ہے اس لئے افراد کو مملکت کے بنائے ہوئے پروگرام پر چلنا چاہئے اسی کو کلّی مملکت یا مملکتی اشتراکیت کہتے ہیں۔ یہ اجتماعیت کے مقابلہ میں ایک انقلابی چیز ہے اس نظام کے تحت اٹلی اور جرمنی میں ہر قسم کا ظلم روا رکھا گیا۔ اور اتحادیوں کے ہاتھوں موجودہ جنگ عظیم میں اس نظام کے پرخچے اُڑا دیئے گئے۔ تیسرا طریقۂ کار پیشہ سری کا نظام ہے، اس نظام کے تحت پیشہ داری یا طبقہ داری تقسیم کی گئی، مثلاً صنّاع، کاشتکار، لوہار، سنار، پریس مین وغیرہ اور سرمایہ داروں سے زبردستی دولت کھینچ کر ان کے سپرد کی گئی کہ سنڈیکیٹس یہ دولت ساوی طور پر آپس میں تقسیم کریں۔ اور حکومت کی باگ ڈور بھی خود ہی سنبھال لیں، جہاں تک قانون سازی کا تعلق ہے۔ یہ ایک اہم کام ہے۔ اس کو سنڈیکیٹس انجام نہیں دے سکتے۔ اس کے لئے اعلیٰ دل و دماغ کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ نظام جس پر فرانس میں عمل کیا گیا ناکام ثابت ہوا۔ چوتھا طریقۂ کار گلڈ اشتراکیت کا نظام نامہ ہے جو انگلستان کے اشتراکین پیش کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ قرون وسطیٰ سے انگلستان میں جو گلڈس صنّاعوں نے قائم رکھے تھے صنعتی انقلاب کے بعد ان کا زوال ہو گیا تھا۔ وہ اب بھی قائم ہیں، پیدائش دولت کا کام ان گلڈس کے سپرد کر دیا جائے کارخانوں کے قیام سے بیروزگاری بڑھتی ہے۔ اس طرح اس نظام کے تحت گھریلو صنعتوں کو فروغ پہنچانے کے پورے پورے مواقع ہوں گے۔ ہر گلڈس کے اراکین اپنے نمایندے منتخب کریں۔ ہر گلڈ ایک حلقہ تصوّر کیا جائیگا، اور ان کو مساوی درجہ دیا جائیگا، حکومت، پیدائش دولت کے کام میں مداخلت نہ کرے بلکہ وہ گلڈ کے ان منتخبہ اراکین پر یہ کام چھوڑ دے اور صارفین دولت کا کام مملکت اپنے ذمہ لے ان دونوں طبقوں کے درمیان وفاق قائم ہو مملکت صارفین دولت کا کام کریں اور گلڈس پیدائش دولت کا کام کریں۔ دونوں کے نمایندے ایک جگہ جمع ہو کر ایک مشترکہ جماعت بنالیں۔ اس نظام پر عملدرآمد نہ ہو سکا گلڈ ٹوٹ گئے، وہ فضا غائب ہو گئی۔ گلڈ کے سپرد پیدائش دولت کا کام کیا جائے تو پیدائش آہستہ ہو گی۔ اگر تمام دنیا اس نظام نامہ پر عمل کرے تو شاید یہ نظام چل نکلے، لیکن آج دنیا اتنی آگے بڑھ چکی ہے کہ لوٹ کر اس پرانے نظام کو اپنا نہیں سکتی، اس طرح ان نظاموں میں بہرحال سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیاں جوں کی توں موجود ہیں۔ اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف ہڑبونگ مچانے والوں کا منھ بند کرنے کے لئے کیپٹلزم کو نئے نئے نام اور نئے نئے روپ دیکر قائم رکھا گیا ہے۔ !

ایک مفکر لکھتا ہے۔ مادہ فنا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اٹھارویں صدی اور انیسویں صدی کے سائنس کی پکار تھی اٹھارویں صدی کی ابتداء میں منطق و فلسفے نے بھی عقل کے سپرد سارے عالم کی حکومت کر دی تھی یہ اقلیت انتہا پسندانہ ہوئی اور پھر بر خود غلط ہو کر رہ گئی، فرانس میں فیور باش، جرمنی میں کانٹ اور مارکس اور انگلستان میں اسٹوارٹ مل وغیرہ نے سارے فلسفۂ حیات کی بنیاد مادیت پر رکھی، اگرچہ ہیگل اور برگسن کو حقیقت مطلق اور روحِ وجدان کے جلوہ گریزاں کا احساس ہو گیا تھا۔ تاہم مغربی تمدن پر مادہ پرستی چھائی رہی، اور بے مقصد شتر بے مہار سائینس انسانوں کی نکیل پکڑے ان سے بادیہ گردی کراتی رہی، رفتہ رفتہ مغربی تہذیب کا سالار کارواں

مارکس بن گیا۔ مارکسیت اور اشتمالیت افادیت اور سرمایہ داری کی ترقی یافتہ صورت ہے اور بس۔ مارکسیت اور اشتمالیت کی روح وہی سرمایۂ مادّی ہے۔ صرف قالب بدلا ہوا ہے، اور حیثیت زیادہ منظّم، زیادہ وسیع۔ زیادہ عظیم، اور زیادہ جابر بنتی جارہی ہے۔ لیکن عین اسی وقت مشیت فطرت اور دست قدرت نے مادہ کی خود غارتگری کو عالم آشوب طور پر ظاہر کردیا۔ ایٹم بم صرف ایک تجربہ ہی نہیں بہت بڑی تنقید بھی ہے۔ ایٹمک بمباری کے مادّی نتائج تخیل عالم میں جاپان کے لرزہ خیز واقعات کے ذریعہ مضروب کئے گئے ہیں۔ اس کے ممکنہ روحانی نتائج اس سے کہیں زیادہ اثر خیز ہونگے، ایک معنی میں مادیت نے مادیت کو ہلاک کردیا۔ مارکسیت کے فلسفہ کی بنیاد مادہ کی ابدیت پر قائم تھی۔ اب یہ ثابت ہوچکا ہے کہ مادہ فانی ہے اور قوت حاصل کائنات ہے۔ آج تہذیب اس مقام پر آکھڑی ہوئی ہے جب خود سائنس کو زندگی کی غیر مادی وجدانی اور روحانی قدروں اور معیاروں کی تلاش، جستجو اور تحقیقات کرنی پڑیگی۔ مارکسیت کی بنیادیں ہل گئیں، مارکسیت کا نظریہ تاریخی بھی اسی مادّی تشریح و تغیر کے سہارے پروان چڑھا تھا۔ اور مارکسی اشتمالیت کے اعتقادی نظام کی جڑیں بھی مادّی قدروں اور معیاروں کی زمین میں پیوست ہیں۔ آج انسانی تمدن دوراہے پر کھڑا ہے یا تو اسے مادیت کی غلامی پناہ دیکر برباد کردیگی یا اسے روحانیت اور مادیت میں مفاہمت کرنی پڑیگی۔

اور بالآخر یہ کہنا کہ سرمایہ دارانہ نظام کا مستقبل بھیانک ہے اور انجام کار اشتراکیت اس کی جگہ لےلیگی، اس کے متعلق کوئی تیقّن کے ساتھ قطعی رائے نہیں دی سکتا۔ کیونکہ انسانی زندگی سے ہمیشہ عجیب و غریب غیر یقینی عناصر چمٹے رہتے ہیں۔ اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ سرمایہ دارانہ نظام جو ڈیڑھ سو صدی سے قائم ہے مستقبل قریب میں ختم ہوجائیگا۔ اور فلاں نظام اس کی جگہ لےلیگا۔ اشتراکیت کے علمبرداروں کا خیال ہے کہ دنیا میں پہلے جاگیردارانہ نظام تھا اس کے بعد کیپیٹلزم نے جنم لیا، اور اب اس کی جگہ اشتراکیت لےلیگی۔ لیکن مختلف نظاموں کے تصادم سے 'سوشلزم' بھی جنم لے سکتا ہے اور باربرزم' بھی وجود میں آسکتا ہے۔ قرائن ضرور اس بات کی دلالت کرتے ہیں کہ اشتراکیت اپنے اچھے اصولوں کی وجہ سے ممکن ہے سرمایہ دارانہ نظام کے تحت سانس لینے والے لوگوں کے دماغوں کو کیپچر کرلے۔ علاوہ ازیں سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیوں کو کنٹرولڈ کیپیٹلزم کے ذریعہ بھی دور کیا جاسکتا ہے۔ یہ کہنا کہ اشتراکیت بہرحال سرمایہ دارانہ نظام کی جگہ لیگی غلط ہے۔ کیونکہ یہ کوئی صحیفۂ آسمانی تو نہیں ہے کہ تمام نظاموں کے آخر میں، اپنے آپکو نعم البدل کے طور پر پیش کرسکے، یہ ممکن ہے کہ انسان "گولڈن ایج" کو جنم دے یا "باربرس ایج" کو واپس بلالے۔ کیونکہ "سوشل سائنس" کے تحت عقلی اور غیر عقلی عناصر ہمیشہ انسانی زندگیوں اور ذہنیتوں میں انقلاب پیدا کرتی رہتی ہیں۔

ادارہ

نقد و نظر

ہفتہ وار "رباب"

مدیر: محمد عثمان (عیگ) پتہ:۔ چارکمان حیدرآباد دکن۔ زرسالانہ للعہ فی پرچہ ۴ر

"رباب" ایک نیا ہفتہ وار رسالہ ہے جو ۲۳ مئی ۴۶ء سے عرض وجود میں آیا ہے، اسوقت تک رباب کے کئی شمارے شائع ہو چکے ہیں، رباب کی پیشانی پر یہ شعر درج ہے ؎

نغمے شرر فشاں ہوں، اُٹھا آتشیں "رباب" مضراب بیخودی سے بجا سازِ انقلاب

جو حقیقتاً رباب کے ترقی پسند رجحانات کا آئینہ دار ہے۔ رباب اگرچہ ایک ہفتہ وار رسالہ ہے مگر رسالہ کی ضخامت، مضامین کا تنوع ترتیب کی خوش سلیقگی، کتابت و طباعت کی پاکیزگی اُسے اچھے اچھے ماہناموں کے مقابلہ میں لا کھڑا کرتی ہے۔ جہاں تک نصب العین کا تعلق ہے، رباب افکار کی طرح صالح اور ترقی پسند ادب کی ترویج و اشاعت کے لئے میدان ادب میں آیا ہے اور یہ امر باعث مسرت ہے کہ حیدرآباد کے اس رسالہ نے ملک کے عام ادبی رجحانات کے پیش نظر گو کچھ تاخیر سے تاہم نہایت مناسب اور وقت کی ضروریات کے مطابق قدم اُٹھایا ہے۔ ابتدائی نمبروں میں بعض مضامین نظم و نثر مطبوعہ شائع کئے گئے ہیں۔ امید کہ ادارہ رباب آئندہ ایسے مضامین کی مکرر اشاعت سے احتراز کریگا۔ کیونکہ یہ عمل پرچہ کی ترقی میں سدِ راہ ہوگا۔ ہم خلوص دل سے رباب کا خیر مقدم کرتے ہیں اور اُس کی ترقی کے خواہ ہیں۔

سالنامہ "آجکل"

ملنے کا پتہ:۔ دفتر رسالہ "آجکل" راجپور روڈ نئی دہلی۔ قیمت عمر۔

دہلی سے ایک مشہور اور معیاری رسالہ آجکل کے نام سے شائع ہوتا ہے جسے آغا محمد یعقوب دواشی کی خدمات بحیثیت مدیر اعلیٰ حاصل ہیں۔ حال ہی میں اس رسالہ نے اپنا سالنامہ شائع کیا ہے۔ ترتیب کے لحاظ سے سالنامہ کو سات عنوانات پر تقسیم کیا گیا ہے اور ہر عنوان کے ذیل میں بہترین مضامین جمع کئے گئے ہیں۔ ترتیب میں ادبی سلیقہ اور علمی شعور نمایاں ہے حصہ تاریخ میں ترکی میں صحافت، چین میں سائنس کی ترقی، سائنس میں قدیم عرب و ہند کا اشتراک نہایت قیمتی معلومات پیش کرتے ہیں۔ تنقیدی ادب میں خلط مبحث، ہندوؤں کے احسانات اردو ادب پر اور احمد شاہ ابدالی کی پشتو شاعری مضامین نگار حضرات کی وسعت معلومات اور بلندئی فکر کا ثبوت ہیں۔ عالمگیر مسئلہ خوراک، جزائر بحر الکاہل کا تیل بہترین اقتصادی معلومات کے حامل ہیں افسانوی ادب میں تسنیم سلیم چھتاری اور راجیندر سنگھ بیدی کے افسانے قابل داد ہیں۔ بقیہ افسانوں کے انتخاب میں ادارہ کو زیادہ دقت نظر سے کام لینا چاہئے تھا۔ حصۂ نظم میں بھی بعض ایسے گمنام حضرات موجود ہیں جو معیاری رسائل میں نظر نہیں آتے تصویر تاریخ کا ایک وسیع اور خاموش باب نگاہوں کے سامنے رکھدیتی ہیں۔ بحیثیت مجموعی یہ سالنامہ ۴۶ء کے ادبی سرمایہ میں ایک اچھا اضافہ ہے۔

ہفتہ وار "الحمرا"

ایڈیٹر: خلیل بدر بی۔ ٹی ایچ۔ پتہ:۔ دفتر الحمرا۔ بھوپال۔ زرسالانہ:۔ عصر فی پرچہ ۳ر

"الحمرا" جتنا حسین نام ہے اتنا ہی حسین یہ ہفت روزہ پرچہ ہے جو خلیل بدر جیسے ہونہار نوجوان ادیب کی زیر ادارت حال ہی میں بھوپال سے شائع ہوا ہے، ترتیب و تدوین کتابت و طباعت نہایت عمدہ اور مضامین نظم و نثر میں کافی تنوع پایا جاتا ہے متعلقات اور اسلامیات کے علاوہ عام سیاست پر آزادانہ اور بے لاگ تبصرے الحمرا کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ الحمرا ہندوستان کے علاوہ بیرون ہند میں بھی اپنا وسیع حلقۂ اشاعت رکھتا ہے۔ سرورق بھوپال کے بہترین آرٹسٹ ظفر کی فنکارانہ صلاحیتوں کا ایک عملی نمونہ ہے۔ ہم قارئین افکار سے اس پرچہ کی سرپرستی کی سفارش کرتے ہیں۔

نمائندۂ افکار مقیم بمبئی کے قلم سے

فلمستان

ہندوستانی فلم بیرونی ممالک میں

یہ امر موجب طمانیت ہے کہ ہندستانی فلم بیرونی ممالک میں بتدریج غیر معمولی مقبولیت حاصل کرتے جا رہے ہیں، امریکہ میں "ڈاکٹر کوٹنس" کے انگریزی زبان میں ریلیز کئے جانے کے انتظامات قریب قریب مکمل ہو گئے ہیں۔ "دھرتی کو لال" کی نمائش بھی عنقریب امریکہ میں ہونیوالی ہے۔

"ہمراہی" کا سنگم

فلمی دنیا میں اس خبر سے استعجاب کی لہر دوڑ گئی ہے کہ "ہمراہی" کی ہیروئن بنیتا بوس اور اس فلم کے افسانہ نگار جیوتر موئے رائے زندگی کے راستے پر حقیقی معنوں میں "ہمراہی" بن گئے ہیں۔ ایک ادیب اور اسٹار کے اس مسرت ناک ملاپ پر شاید ہزار دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو جائیں گی۔

اشوک کمار اور کانن

ایک غیر مصدقہ اطلاع مظہر ہے کہ اشوک کمار نے کلکتہ میں دو فلم میں بھارتی کے ساتھ اور دوسری میں کانن کے ساتھ کام کرنے کے لئے معاہدہ کر لیا ہے۔

"فٹ پاتھ" پر

ڈائرکٹر بوس نے اپنے تازہ شاہکار کا نام "فٹ پاتھ" تجویز کیا ہے۔ جس میں فلمستان نوکھے انداز میں "فٹ پاتھ" کا حقیقی نقشہ پیش کریگا۔

انفرمیشن فلمز

انفرمیشن فلمز آف انڈیا اور انڈین نیوز پریڈ کو حکومت کے ہاتھ سے بمبئی کی پرائیویٹ فرم کو منتقل کر دیا گیا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ڈیفنس آف انڈیا رولز کے زیر سایہ انفرمیشن فلمز کی نمائش کی عمر اور بڑھ گئی ہے۔

شوالہ

کلدیپ پکچرز لمیٹڈ لائل پور کے مینجنگ ڈائرکٹر دیوان کلدیپ چند اور جنرل منیجر مسٹر ٹیکراج پروڈکشن کے سلسلہ میں بمبئی پہنچ گئے ہیں۔ آپ وہاں اپنے اولین شاہکار "شوالہ" کے لئے مشہور "فلمی پجاریوں" کا انتخاب عمل میں لائیں گے۔ آپ کی کوشش یہ ہے کہ "شوالہ" میں بہترین کاسٹ پیش کریں۔ ناموں کا عنقریب اعلان کیا جائیگا۔

"نرگس" کی بے نوری

بیان کیا جاتا ہے کہ اے۔ آر پروڈکشنز لاہور اور پربھات کے درمیان ناموں کی یکسانیت پر تنازعہ پیدا ہو گیا ہے۔ کیونکہ دونوں کمپنیوں نے اپنے آنے والے فلموں کے نام "نرگس" مشتہر کئے تھے۔ تفصیلات کا انتظار ہے۔

مرزا جی بمبئی میں

اطلاع ملی ہے کہ مشہور ادیب و افسانہ نگار مرزا ادیب کسی اہم فلمی کام کے سلسلے میں آجکل بمبئی میں براجمان ہیں۔

پاپولر انڈیا کی "کامیابی"

پاپولر انڈیا پروڈکشنز لمیٹڈ نے اپنے پہلے فلم کا نام "کامیابی" رکھا ہے۔ اس کے کاسٹ میں مشہور اداکاروں کے نام شامل ہیں۔

بُت تراش

پنجاب کی مشہور کاروباری شخصیت ملک اے۔ ایچ خان مالک ادارہ بتندہ اپنی اولین تصویر "بُت تراش" میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ اسے گارگا اور افضل بیک وقت دو ہدایت کار فلما رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ "بُت تراش" ہندستان کا پہلا شاہکار ہوگا، جسے غیر ممالک کے لوگوں کے سامنے فخریہ پیش کیا جا سکیگا۔ ہرش، مس شیریں، فریدہ وغیرہ اس میں کام کر رہے ہیں۔

"پت جھڑ" کی فلمبندی

پنچولی آرٹ پکچرز کی آنیوالی فلم "پت جھڑ" کی کاغذی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں، چند دنوں میں اسکی فلمبندی کا کام شروع ہو جائیگا۔ مسٹر رام نرائن دوبے اس فلم کی

مشرقی دواخانہ

بھوپال میں عرصے سے ایک ایسے طبی دواخانہ کی کمی محسوس کی جا رہی تھی جس میں تمام طبی مرکبات صحیح اوزان کے ساتھ جدید سائنٹفک طریقوں سے کسی مستند اور ماہر فن طبیب کی نگرانی میں تیار کئے جائیں۔

چنانچہ اس غرض سے **زبدۃ الحکماء حکیم سید قمیر الحسن صاحب** کے زیر نگرانی قمر منزل بھوپال میں **"مشرقی دواخانہ"** بھوپال کا قیام عمل میں لایا گیا ہے، اس دواخانہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بھوپال کے مشہور نامور حاذق و ہر دلعزیز طبیب **استاذ الاطباء حکیم مولوی حاجی نور الحسن صاحب** مرحوم و مغفور اور **فخر الحکماء حکیم حاجی مولوی سید ضیاء الحسن صاحب** افسر الاطباء ریاست بھوپال مستند طبیہ کالج دہلی و تلمیذ خاص عالیجناب مسیح الملک رحمۃ اللہ علیہ کے خاص اور صدری مجربات جو انمول جواہر کی حیثیت رکھتے ہیں تیار ملیں گے۔

تفصیلات کا انتظار کیجئے!

مہتمم مشرقی دواخانہ بھوپال

اطلاع

نادرہ الائیڈ انجنیئرس نے اہل بھوپال
کی شدید ضروریات کے پیش نظر عورتوں
اور بچوں کے ہر قسم کے علاج کے لئے
"نادرہ میڈیکل کلینک" واقع چوراہہ جنتامن
چوک کا افتتاح بتاریخ ۱۶ جولائی ۱۹۴۶ء
کرویا ہے۔ "نادرہ میڈیکل کلینک" میں ایک
بی۔ایس سی، ایم۔بی۔بی۔ایس لیڈی ڈاکٹر
۴ بجے شام سے ۸ بجے شب تک موجود رہتی ہے
لہذا ضرورت مند اپنے شہر کے اس مفید مرکز سے
زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں۔ ادویات، سند یافتہ
کمپاؤنڈروں کی زیر نگرانی تیار کیجاتی ہیں۔

منظور حسن، بی، اے
جنرل مینجر نادرہ الائیڈ انجنیئرز (رجسٹرڈ) بھوپال

طحال، بخار اور تجاری کی
واحد دشمن

"کونٹون" ہے

جو ہر انگریزی دوا فروش سے مل سکتی ہے

المشتہر
بابو لال اگروال
فار نادرہ الائیڈ انجنیئرز (رجسٹرڈ) برانچ ابراہیم پورہ۔ بھوپال

بابولین (رجسٹرڈ)

بچوں کے امراض کی لاثانی دوا



بچوں کے پیٹ کے درد، پیٹ پھولنے، مروڑ اور کالی کھانسی وغیرہ کے لئے بابولین سے بہتر کوئی دوسری دوا نہیں، دانتوں کے نکلتے وقت بابولین کا استعمال حیرت انگیز اثر دکھاتا ہے۔

تیار کنندہ
دی باتھ کیمیکل ورکس بمبئی نمبر ۲۔
نمبر ۲ و ۳ - کلائیو اسٹریٹ کلکتہ۔

سول ایجنٹس برائے سی، پی۔ برار۔ سی، آئی۔ راجپوتانہ | نادرہ الائیڈ انجنیئرز (رجسٹرڈ) ہیڈ آفس۔ اختر منزل بھوپال۔

نوٹ:۔ اسٹاکسٹ ہر بڑے شہر میں موجود ہیں۔

نادرا میڈیکل ہال

اسرار منزل ابراہیم پورہ۔ بھوپال میں

تشریف لاکر اپنے پیچیدہ اور خطرناک امراض کا علاج کیجئے۔ لا علاج امراض سے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں، صرف ایک مرتبہ ہمیں خدمت کا موقع دیجئے۔ آپ یقیناً صحتیاب ہوجائینگے۔ ایک بی۔ایس۔سی، ایم، بی، بی، ایس ڈاکٹر آپکی خدمت کے لئے حاضر ہے، جو بلا کسی معاوضہ کے آپکو مشورہ دیگا۔ ادویات سند یافتہ کمپونڈروں کی نگرانی میں تیار کیجاتی ہیں اور نہایت مناسب قیمت لیجاتی ہے۔ ہر قسم کی انگریزی پیٹنٹ ادویہ اور انجکشن کنٹرول نرخ پر خرید فرما کر کیش میمو حاصل کیجئے

اوقات مطب
شام ۵ بجے سے ۹ بجے شب
بروز جمعہ
شام ۶ ۳/۴ سے ۹ بجے شب
اوقات ڈسپنسری
صبح ۸ سے ۱۲ بجے دن - شام، ۴ سے ۹ بجے شب

المشتہر:۔ نرنجن سنگھ
اکونٹنٹ نادرا میڈیکل ہال بھوپال

قابلِ مطالعہ کتابیں!

۱- جھلکیاں	رہبر ٹپیالوی	۲/ ۴/
۲- گھروندے	عرش تیموری	۱/ ۸/
۳- دل کے آنسو	رئیس احمد جعفری	۱/ ۴/
۴- میر صاحب	عادل رشید	۳/ ۰/
۵- اپنا گھر	مائل ملیح آبادی	۱/ ۸/
۶- سوسائٹی کے گناہ	حکیم یوسف حسن	۱/ ۸/
۷- رات کی رانی	" "	۲/ ۰/
۸- خوابوں کے ویرانے	حسن عزیز جاوید	۲/ ۰/
۹- زلزلے	قدوس صہبائی	۲/ ۱۲/
۱۰- روسی ظرافت	ضیائی	۲/ ۴/
۱۱- کیلے کا چھلکا	سندباد جہازی	۲/ ۰/
۱۲- گفت و شنید	بشیر احمد	۲/ ۰/
۱۳- گرد و پیش	عبداللہ بٹ	۳/ ۰/
۱۴- افسانہ زریں	اسماء	۱/ ۸/
۱۵- جرم و سزا	عبداللہ بٹ	۱/ ۴/
۱۶- دُکھ سُکھ	اعظم کریوی	۲/ ۸/
۱۷- خندۂ دل	کوثر چاندپوری	۲/ ۸/
۱۸- گل و لالہ	" "	۲/ ۸/
۱۹- لیل و نہار	" "	۱/ ۰/
۲۰- دنیا کے عظیم ترین افسانے	گوپال متل	۲/ ۰/
۲۱- کنول	اعظم کریوی	۲/ ۸/
۲۲- نئی فضائیں	قمر تسکین	۲/ ۸/
۲۳- نئی قندیلیں	" "	۲/ ۰/
۲۴- سبز شعاعیں	ریاض جنیوی	۱/ ۶/
۲۵- فاؤسٹ	ریاض بی، اے	۱/ ۸/
۲۶- روسی افسانے	منٹو	۱/ ۸/
۲۷- موپاساں کے افسانے	نصیر حیدر	۱/ ۸/
۲۸- عجیب	قاضی عبدالغفار	۱/ ۸/
۲۹- چوراہا	قیسی رامپوری	۲/ ۱۲/
۳۰- زرینہ	عبدالرحمٰن سورتی	۱/ ۸/
۳۱- سماج کے ستون	قیسی رامپوری	۰/ ۱۰/
۳۲- دھنک	صادق الخیری	۲/ ۰/
۳۳- آرسین لوپن جاسوس	تیرتھ رام	۳/ ۸/
۳۴- مغرب کی عیش پسندیاں	"	۱/ ۸/
۳۵- زندگی	ملا رموزی	۳/ ۰/
۳۶- ہما خانم	سجاد حیدر یلدرم	۲/ ۸/
۳۷- شاعرات اردو	جمیل احمد	۵/ ۱۲/
۳۸- منتخب داغ	احسن مارہروی	۵/ ۰/
۳۹- جذبات قیس	قیس آروی	۲/ ۸/
۴۰- مضامین مالک	عبدالمالک آروی	۲/ ۸/
۴۱- الہامات شاد	شاد عظیم آبادی	۰/ ۸/
۴۲- رعنائیاں	شکیل بدایونی	۳/ ۰/
۴۳- نغمے کی موت	کرشن چندر	۲/ ۴/
۴۴- الطاف کے گیت	الطاف مشہدی	۱/ ۸/
۴۵- یہ دنیا ہے	بدر شکیب	۲/ ۰/
۴۶- ۱۹۴۳ء کے بہترین افسانے		۲/ ۰/
۴۷- اقبال آرٹ	لطیف فاروقی	۱/ ۸/
۴۸- پگڈنڈی	افضل عابدی	۲/ ۸/
۴۹- پھانسی	منٹو	۱/ ۸/
۵۰- حسن و شباب	ماہر القادری	۲/ ۰/

نوٹ:- تاجروں کو معقول کمیشن دیا جائیگا

ملنے کا پتہ

عتیق الرحمٰن اینڈ سنز تاجران کتب چوک بھوپال